مجوزہ تحقیقی مقالہ برائے ایم-ایس (اردو)

حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ

ANALYTICAL STUDY OF THE SHORT STORIES OF HAMRA KHALIQ WITH REFRENCE TO MARXISM

محقق

سعدیہ ابرار

239-FLL/MSURDU/F20

نگران

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

TH25526

MS
891.4393
ح ٤ س

اردو ادب ۔ افسانہ
" " ۔ فلسفہ جدید
" " ۔ مارکسزم

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **SADIA ABRAR**

Title of the Thesis: حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ

Registration No: **239-FLL/MSURD/F20**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner:

Dr. Bilal Sohail
Assistant Professor
F.G.Sir Syed College, Mall Road
Rawalpindi

Internal Examiner:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD.

...IVERSITY ISLAMABAD

8881743

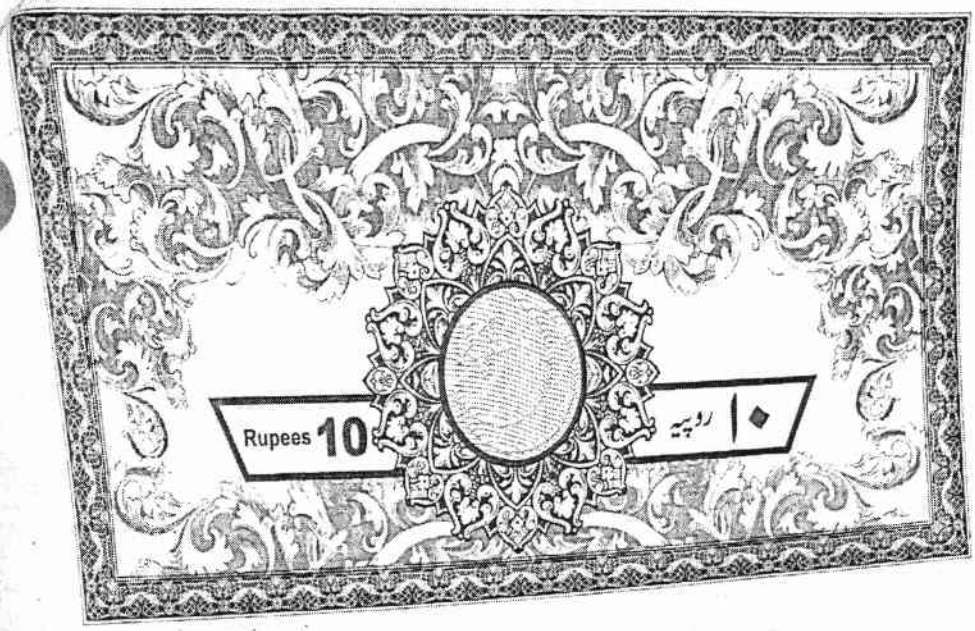

Rupees 10 ۱۰ روپیہ

بیان حلفی

منکہ مسماۃ سعدیہ ابرار دختر ابرار خان رجسٹریشن نمبر 239-FLL/MSURDU/F20 حلفیہ بیان کرتی ہوں۔

یہ کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ حمرہ خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ براے حصول سند ایم فل۔ ڈاکٹر غلام فرید کی نگرانی میں اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس میں تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ نیز اس سے پہلے یہ کسی جامعہ میں براے حصول سند پیش نہیں کیا گیا ۔اس میں شامل تمام حوالہ جات کا اسناد موجود ہے اور میں اس مقالہ کے تمام نتائج اور تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔ یہ کہ مزکورہ بالا مندرجات جو میں نے بیان کیے ہیں وہ میرے علم اور یقین کے مطابق صحیح اور درست ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ کا امر مخفی نہیں رکھا گیا ہے۔ المرقوم 06-07-2022

العبد

دستخط معہ انگوٹھا Saelia

شناختی کارڈ نمبر 81202-9535624-4

گواہ

نام

شناختی کارڈ نمبر 61101-17345...

ATTESTED

TARIQ IQBAL MAHER
Advocate High Court
Oath Commissioner
ISLAMABAD

06 ... 2022

سیریل نمبر 145

10/-

مسماۃ سعدیہ ابرار دختر ابرار خان شناختی کارڈ نمبر 81202-9535624-4 ساکن ڈاکخانہ خاص جرائی ضلع کوٹلی

06-07-2022

(برائے بیان حلفی)

Sadia

ADEEL KHALID
Stamp Vendor LIC # 358
G-9 Markaz, Islamabad

نوٹ:
یہ اشٹام پیپر کسی بھی سرکاری اراضی CDA یا
ریاستی اداروں کی ملکیت میں کسی دوسری اراضی کی
خرید و فروخت کے لئے جاری نہیں کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ سعدیہ ابرار رجسٹریشن نمبر239-FLL/MSURDU/F20 نے ایم ایس اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **"حمرا خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ"** رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔ غلام فریدہ

Gulam Farida

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ایم ایس کرنے کے ارادے کے پس پشت تحقیقی مقالہ لکھنے کی خواہش تھی لیکن جب تحقیق کے میدان میں قدم رکھا تو پتہ چلا کہ یہ وادی پر خار ہے جس میں چلنے سے پاؤں بھی لہولہان ہوتے ہیں۔ حوصلے بھی تھک جاتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اسی وادی میں کئی مہربان آوازیں، کوئی مشفق رفاقتیں رہنما بن جاتی ہیں۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد شعبہ اردو میں ایم ایس کا کورس مکمل ہونے کے بعد جب موضوع کی باری آئی تو کئی طرح کے موضوعات زیر غور آئے۔ میری دلچسپی چونکہ آغاز ہی سے حمراء خلیق کے کام پر تحقیق کرنے کے حوالے سے تھی۔ اس لئے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ حمراء خلیق کے فکشن پر تحقیقی کام کروں۔ اسی خواہش کے پیش نظر جب میں نے اپنے اساتذہ کرام سے گفتگو کی تو انہوں نے حمراء خلیق کے فکشن میں مارکسی حوالے سے کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے اپنے منتخب گائیڈ کی زیر نگرانی خاکہ ترتیب دیا اور کام شروع کیا۔

دوسرے باب میں شعبہ جاتی عدم قبولیت (ALIENATION) کے تناظر میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں بالائی ساخت کے تناظر میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ اور چوتھا باب حمراء خلیق کے افسانوں کے کرداروں کا مارکسی مطالعہ کیا گیا ہے۔

ماحصل میں ان تمام ابواب میں کیے گئے تجزیے کو سمیٹا گیا اور سوالات تحقیق کے مطابق نتائج مرتب کیے۔ مقالے کو تحریر کرنے کے لیے بنیادی ماخذ یعنی مژگاں تو کھول، بادلوں کی اوٹ سے کے علاوہ دیگر کتب، ادبی رسائل، انٹرنیٹ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنفہ کا انٹرویو بھی لیا گیا جسے مقالے کے اختتام پر بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔

موضوع پر جب کام کرنا شروع کیا تو مجھے لگا یہ کام با آسانی پایہ تکمیل تک پہنچا دوں گی۔ جیسے جیسے کام بڑھتا گیا تو پتہ چلا تحقیقی مقالہ نگاری ایک صبر آزما اور کٹھن مرحلے کا نام ہے لیکن اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے تحقیقی مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت اور توفیق عطا کی۔ تحقیق کے دوران کبھی کبھی ایسے دن بھی آئے کہ موضوع کی مشکلات مواد کی عدم دستیابی کچھ لوگوں کی حوصلہ شکنی اور نامناسب رویوں نے سارے حوصلے چھین لے مگر اساتذہ کرام اور مخلص دوستوں کی حوصلہ افزائی نے مجھے ہمت ٹوٹنے نہ دی۔ تحقیق کے دوران حتی الوسع کوشش کی کے جو بھی مواد اس میں شامل کیا جائے وہ مستند ہو جو تحقیقی معیار پر پورا اتر سکے۔

تحقیق کے دوران جن اساتذہ کرام اور دیگر احباب کا تعاون مجھے حاصل رہا ہے ان سب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ ان میں نہایت شفیق حلیم طبیعت کی شخصیت میری نگران مقالہ ڈاکٹر غلام فریدہ مدبرانہ رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے اس مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچاپائی۔ اپنی مصروفیات کے باوجود میرے ساتھ تعاون کیا اور مجھے کبھی مایوس اور پریشان نہ لوٹایہ اور ان کے دوستانہ رویہ نے میرے حوصلے کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میم فریدہ نے بہترین گائیڈ ہونے کا حق ادا کیا۔ اور انہی کی وجہ سے میں مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت اور شاد و آباد رکھے۔ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی شعبہ اردو کی ڈین ڈاکٹر نجیبہ عارف کا شکرہ ادا کرتی ہوں اور اپنے شعبہ کے تمام اساتذہ اکرام کا جن کی بدولت آج میں اس قابل ہوئیں۔

تمام دوست احباب، عزیز و اقارب کا شکرہ ادا کرتی ہوں۔ اس کے بعد اپنے والد محترم والدہ صاحبہ، دادا، دادی جن کی پر خلوص دعائیں میری کامیابی کیلئے تھیں۔ اللہ ان کا سایہ ہم پر سلامت رکھے۔ ایک اور اہم شخصیت میرے استاد محترم صفدر حیات خاکسار صاحب کا جن کی وجہ سے میں اردو ادب کی جانب رغائب ہوئی۔ جن کی دعاوں کی وجہ سے میں نے آج اپنا مقالہ مکمل کیا، جن کی وجہ سے ایم ایس اردو میں داخلہ لیا آپ کی شکرہ گزار ہوں۔ آخر میں اپنے شوہر کی شکرہ گزار ہوں جن سپوٹ کی وجہ سے میر امقالہ مکمل ہوا۔

سعدیہ ابرار

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	باب اوّل:	
۲۔	مارکسزم کے ادبی مباحث	۱
۳۔	مارکسزم کی تاریخ اور معنوی مباحث	۱
۴۔	ماکسزم کے اجزائے ترکیبی	۶
	جدلیاتی مادیت	۶
	تاریخی مادیت	۸
۵۔	مارکس کے نظریات	۹
۶۔	مارکسی نظریات اور ادب	۱۱
۷۔	اردو ادب میں ماکسزم کی روایت	۱۳
	راجندر سنگھ بیدی	۱۵
	عصمت چغتائی	۱۶
	اوپندر ناتھ اشک	۱۶
	حیات اللہ انصاری	۱۷
	ہاجرہ مسرور	۱۸
	احمد ندیم قاسمی	۱۸
	حمراء خلیق	۱۹

حوالہ جات ۲۶

۸۔ **باب دوم:**

شعبہ جاتی عدم قبولیت (**Alienation**) کے تناظر میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ ۲۵

۹۔ گھریلو زندگی کی عدم قبولیت ۲۸

۱۰۔ معاشرتی عدم قبولیت ۳۹

۱۱۔ شعبہ جاتی عدم قبولیت ۴۹

حوالہ جات ۵۸

۱۲۔ **باب سوم:**

بالائی ساخت کے تناظر میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ ۶۱

حوالہ جات ۹۱

۱۳۔ **باب چہارم:**

حمراء خلیق کے افسانوں کے کرداروں کا مارکسی مطالعہ ۹۴

حوالہ جات ۱۲۵

ماحصل ۱۲۸

کتابیات ۱۳۵

باب اوّل

مارکسزم کے ادبی مباحث

باب اول

مارکسزم کے ادبی مباحث

مارکسزم کی تاریخ اور معنوی مباحث

کارل ہنرک مارکس کے نظریہ فکر کو مارکسزم کہا جاتا ہے۔ مارکسزم ایک ایسا انقلابی نظریہ ہے جس نے برطانوی معیشت اور جرمن فلسفے کو سامنے رکھتے ہوئے سماجی، معاشی اور سیاسی حرکیات کی نئے سرے سے تشریح کی۔ اس نظریے کی بنیاد ایک ایسا نظام ہے جو انسان کو انسانی سماج کی تاریخ، حالات واقعات جاننے اور انہیں بہتر بنانے کے اصولوں سے وقف کرواتا ہے۔ یہ نظام انسانی زندگی کی اہم قدروں جیسے مساوات، سماجی انصاف، تخلیقی آزادی، بین الاقومی اخوت، جنسی مساوات، سماجی فلاح و بہبود اور بہترین معاشرے کی تعمیر جیسے مثبت رویوں پر زور دیتا ہے۔

بیسوں صدی کے نصف آخر میں اردو ادب میں جن رجحانات کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سے ایک مارکسزم بھی ہے۔ کارل مارکس کے نظریات کے مجموعے کو مارکسزم یا مارکسیت کہا جاتا ہے۔ جو نظریات کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے ترتیب دیئے تھے ان کا دور (۱۸۸۳-۱۸۱۸ء) تک کا تھا۔ سوشلزم کا نام ۱۸ویں صدی کے یورپ میں فرانسیسی انقلاب کے بعد سے رائج ہوا۔ بہت سے مفکرین نے سوشلزم کے بارے میں رائے دی۔ مگر سوشلزم کے بارے میں جامع وضاحت کارل مارکس نے ۱۸۴۸ء میں اپنی کتاب کمیونسٹ مینی فسٹیو میں پیش کی۔

کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو مغربی جرمنی (رائش پرشیا) کے شہر ٹریویس میں پیدا ہوا۔ مارکس کا باپ ایک یہودی وکیل تھا۔ جو مارٹن لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر پروٹسٹنٹ بن چکا تھا۔ مارکس ٹریویس سے بی-اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پہلے لون اور پھر برلن یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے فقہ، تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ مارکس کے باپ نے اس کو قانون پڑھنے بھیجا تھا مگر باپ کی وفات کے بعد وہ فلسفہ کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

مارکس جس وقت برلن یونیورسٹی میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت ہیگل کی دھوم تھی مارکس نے ہیگل کی تصانیف کو بھی پڑھ رکھا تھا اور ہیگل کے مطالعہ سے قبل بھی وہ مشرق کے حالات سے آگہی رکھتا تھا۔ مارکس ہیگل کے فلسفہ جدلیت سے بے حد متاثر تھا۔ ہیگل یونیورسٹی کا طلب علم تھا چنانچہ جب انقلاب فرانس آیا تو ہیگل نے جلسوں میں باغیانہ تقریریں کیں اور انقلابی گیت گائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بیشتر نظریے انقلاب فرانس ہی سے ماخوذ ہیں۔ ہیگل کا نظریہ نظام فکر کا محور تصور مطلق Absolute idea ہے۔ اس کے نزدیک تصور مطلق ہی تمام مظاہر قدرت اور سماجی حقائق کا سرچشمہ ہے۔ اس تصور مطلق کے لیے ہیگل نے گائسٹ (Geist) کی اصطلاح استعمال کی۔ ہیگل کے خیال میں یہ تصور مطلق وجود بالذات ہے۔ "کائنات کا جوہر" ہے عقل کُل ہے۔ "روح عالم" "اجدیت ہے" ابدیت ہے غرضیکہ اس تصور مطلق میں تمام خداوندی صفات موجود ہیں۔ بلکہ وہ خود خدا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہیگل کا تصور مطلق کا تصور صوفیا کے "ہمہ اوست" اور وحدت الوجود" کے عقائد سے ملتا جلتا نظر آئے گا"۔ ۲ فلسفہ سے مارکس کا شغف روز بروز بڑھتا گیا اور اس نے فلسفے میں ڈاکٹری کی ڈگری لینے کی تیاری کی۔ ہیگل کی ارتقائی جدلیت کے مطالعہ نے اس کو نئی بصیرت عطا کی اور اس نے ڈیمقراطیس اور اپی کیورس کے فلسفہ قدرت کے موازنے کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ کائنات کی ہر شے ایٹم سے مل کر بنتی ہے۔ مارکس اپنے مقالے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہیگل کا فلسفہ ایک خواب ہے۔ ایسا خواب ہے جس میں انسان تحصیل ذات کر کے خدا بن جاتا ہے، مگر ہیگل انسان کو ارض موعودہ کی سیر فقط عالم خیال میں کرواتا ہے۔ یہ بیانیہ مارکسزم کی جانب کا یہ پہلا جرات مندانہ قدم تھا۔ مارکس اپنی عملی زندگی میں آکر اخبار نویسی سے وابستہ ہو گیا۔ جس اخبار کا وہ ایڈیٹر تھا اس کو حکومت نے انتہا پسندی کے باعث بند کر دیا۔

اس کے بعد ۱۸۴۳ء میں فرانس چلا گیا بعد ازاں اشتراکیت کا مطالعہ کرنے کے لیے فرانس میں مارکس کی ملاقات اینگلز سے ہوئی جو ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اس طرح مارکس کو برطانوی مزدوروں کے حالات اور برطانوی معیشت کا علم ہوا۔ "اس نے ۱۸۴۸ء میں جرمنی اور فرانس میں ہونے والے دونوں انقلابات میں حصہ لیا اور اس طرح ۱۸۴۹ء میں لندن میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ ۳ مارکس نے اپنی زندگی بڑی مشکلات میں بسر کی بعد ازاں غربت اور مشکلات کے پیشِ نظر اس نے اپنی اولاد کو بھی کھو دیا۔ ان مشکلات کے باوجود وہ کبھی اپنے مقصد سے نہیں ہٹا۔

مارکس اور اینگلز کا ایک بڑا کارنامہ کمیونسٹ مینی فیسٹو کی تصنیف ہے۔ جس میں انہوں نے سائنسی سوشلزم کے بنیادی اصول واضح طور پر بیان کیے ہیں۔ سماجی اور معاشرتی رشتوں اور سرمایہ داری نظام کے حوالے سے ان کے یہ خیالات دنیا بھر کے انقلابیوں کے لیے مشعل راہ بن گئے۔ اس حوالے سے سبط حسن لکھتے ہیں:

> کمیونسٹ مینی فیسٹو مارکس اور اینگلز کی وہ انقلابی تصنیف ہے جس نے شائع ہوتے ہی دنیا میں ہلچل مچادی اور ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ لیکن کہا کرتا تھا کہ: کتابچہ کتابوں سے بھرے ہوئے کئی کتب خانوں پر بھی بھاری ہے۔ اس کی روح آج بھی دنیا بھر کے محنت کشوں اور جوش اور اور ولولہ پیدا کرتی اور ان کی رہنمائی کرتی ہے، اسی لیے مینی فیسٹو کو محنت کشوں کی بائبل بھی کہتے ہیں۔ [۴]

مارکس اور اینگلز کو جرمنی اور فرانس کے انقلابوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن پوری نہ ہو سکیں۔ ان دونوں کی انقلابی جدوجہد میں شمولیت اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ انقلابی عمل کو اُتنا ہی اہم تصور کرتے ہیں۔

مارکس کے سائنسی اور سیاسی نظریات نمایاں طور پر اس وقت متشکل ہوئے جب جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں میں عظیم تاریخی واقعات کی زمین ہموار ہو رہی تھی۔ سرمایہ داری کی ترقی کی وجہ سے یورپ کے بہت سے ملکوں میں جاگیر دارنہ نظام نے ترقی کر لی تھی، مشینوں کی آمد سے سرمایہ کاری کو ترقی ملی جس کی وجہ سے مزدور طبقہ کے لیے مشکلات بڑھ گئیں۔ ایسے میں پرولتاریہ کی شکل ہی تبدیل ہو گی تھی۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں سرمایہ داری کی وجہ سے بورژوا جمہوریت اور قومی آزادی کی تحریکیں نمایاں ہو گیئں۔ کو نمایاں کر دیا۔

مارکس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ سرمایہ دارانہ نظام کے مطالعہ میں صرف کیا اور اس کی سائنٹفک پیش گوئی کی۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام میں کھانا، کپڑے اور دوسری ضروریات کی چیزیں مقامی ضروریات کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ یہ چیزیں جاگیر داروں کے زرعی غلام اپنے اور اپنے جاگیر دار کے استعمال کے لیے پیدا کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ زیادہ چیزیں پیدا کی جانے لگیں اور دوسرے ملکوں میں بھی بھیجی جانے لگیں اس طرح اشیا کا بھی تبادلہ ہونے لگا۔ لیکن پیداوار کا زیادہ حصہ جاگیر دار ہی استعمال کرتے تھے۔ مارکس کی سب سے شاندار کتاب سرمایہ ہے جس میں مارکس نے جدید معاشرے کے اقتصادی قانون حرکت کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ نظام کن طریقوں

سے محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے۔ اس نظام میں اشیاء مارکیٹ کرنے کے لیے پیدا کی جاتی ہیں۔ جو محنت کشوں کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن ان کو اجرت کم دی جاتی ہے۔ مارکسزم کا منشور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل تھا۔ جس میں بورژوا نظام زندگی رائج نہ ہو۔ جس میں سرمایہ دارانہ استحصالی نظام نہ ہو۔ معاشرے میں کسی بھی قسم کی طبقاتی تقسیم نہ ہو۔ چنانچہ مارکس ہر اس نظام کی نفی کرتا تھا جو استحصال پر مبنی ہو۔

بورژوا سماج کی بنیاد دو طبقوں پر قائم ہے۔ جس میں ایک سرمایہ دار اور دوسرا محنت کش شامل ہے۔ سرمایہ دار پیداوار کے ذرائع کے مالک ہوتے ہیں اور یہ محنت کشوں کی محنت خریدتے ہیں۔ شہر کے سرمایہ دار اور گاؤں کے زمیندار اس نظام کا برسر اقتدار طبقہ ہیں۔ یہ پہلے یورپ میں عہد وسطی کے جاگیرداری نظام کے زرعی غلام اور ابتدائی شہروں کے حقوق حاصل کرنے والے شہریوں سے ہی یہ طبقہ بنا جبکہ سرمایہ داروں نے قرون وسطی کے دستکاروں کو مزدور بنایا۔

۱۸۴۴ء میں سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے رابرت اولین کی سربراہی میں ایک تحریک وجود میں آئی جس کا نام "گرینڈ نیشنل کانسولیڈ لیشن ٹریڈس یونین" تھا۔ اس تحریک میں اتنی شدت تھی کہ اس میں کچھ ہفتوں میں ہی اس کے ممبروں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ انگلستان سے مارکس نے اپنی کتاب داس کیپٹل لکھی جس میں اپنے انقلابی نظریات کو علمی صورت میں پیش کیا۔ ٹریڈس یونین کے ساتھ ایک طرف ملک کی اکثر صنعتیں وابستہ تھیں دوسری طرف مزدوروں کی ایک کثیر تعداد زیر اثر آگئی۔ نتیجتاً سرمایہ داروں کے خلاف غصے کی لہر محسوس کی جا رہی تھی کیوں کہ جس طرح سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کر رہے تھے اس استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے انقلاب کی ضرورت تھی۔ اس لیے مارکس اور اینگلز نے یہ کتاب لکھ کر اپنی خدمات سرانجام دیں اور آگے چل کر "چارٹسٹ" تحریک آگئی اور اشتراکی خیالات نمایاں ہوتے گئے اور ان کا موقف تھا کہ امیر طبقہ غریبوں کا کبھی بھلا نہیں چاہ سکتا کیوں کہ ان کی کوشش ہوتی ہے غربا کی محنت سے فوائد حاصل ہوتے رہیں۔ مارکس اور اینگلز نے مزدور طبقے کی بے بسی پر خاصا زور دیا تھا اور ان کے اندر شعور بیدار کرنے کی بھی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنی طاقت کو سمجھیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جدجہد کریں۔ یہاں بنیادی بات یہی تھی کہ مزدوروں کو پہلے اپنے مفادات کے بارے میں علم ہونا چاہیے تب ہی وہ سرمایہ داروں کے مفادات کو سمجھیں گے جو ان سے مختلف ہیں۔ اس طرح پرولتاریوں کے مفادات سامنے آسکتے ہیں۔ ہر ملک کے مزدوروں کا نصب العین سوشلزم اور کمیونزم ہی ہے۔

۱۸۴۸ء میں مارکس نے (Communist Manifesto) کے نام سے تحریک میں مزدوروں کے لیے منشور تیار کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب سرمایہ دارانہ نظام مضبوط ہونے لگا اور سامراجی نظام حکومت عملی صورت اختیار کرنے لگا تو کمیونسٹ پارٹی کے مقاصد میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ لینن نے اس نئی صورت حال کے لیے مارکس کے نظریات اور اصولوں کو پرکھ کر نئے اقدامات کیے۔ کمیونسٹ کے لیے نئے مقاصد متعین کیے، مزدوروں اور کسانوں کے حصول مقاصد کے لیے کمیونسٹ کو حل قرار دیا اور سوشلسٹ نظام قائم کرنے پر زور دیا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کا انقلاب لینن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ مارکسزم کی روشنی میں روس کے حالات کو سمجھ کر نتائج اخذ کیے گئے اور کمیونسٹ پارٹی کو جمہوری اصولوں پر کاربند کیا۔ روسی انقلاب تاریخی اعتبار سے اہم ہے جس سے دنیا کے کئی ممالک متاثر ہوئے۔ ایک طرف تو پہلی جنگ عظیم جس میں جرمنی کو شکست ہوئی تھی اور بہت سے ممالک جن میں برطانیہ، اٹلی، اسپین، رومانیہ، بلغاریہ متاثر ہوئے تھے۔ تو دوسری طرف روسی انقلاب کی وجہ سے زمین ہموار ہو گئی جس کی لہر امریکہ تک نے محسوس کی سب ممالک جنگ عظیم سے متاثر ہوتے ہوئے روسی انقلاب کی جانب رخ کرنے لگے ۔ ہر ملک کے محنت کش اور مزدوروں نے اس انقلاب کا اثر قبول کیا۔ اور اپنے اپنے ممالک میں تحریکیں شروع کر دیں جس کے اثرات اور ممالک پر بھی ظاہر ہونے لگے، ساتھ ہی ایشیائی ممالک بھی متاثر ہوئے۔ روسی انقلاب نے جاپان، چین، کوریا، منگولیا اور ہندوستان پر بھی اپنے اثرات ڈالے۔

۱۹۵۰ء میں چین میں انقلاب رونما ہوا جس نے مارکسزم کے نظریات اور اصولوں کی بنا پر چین کے حالات کا جائزہ لے کر انقلاب کا سب سے موزوں اور مناسب طریقہ کار اپنایا۔ اس انقلاب کے اثرات سے کوریا، ویت نام کے عوام میں بھی بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ کوریا میں جاپان کے خلاف ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، جس کے نتیجے میں انقلابی صورت پیدا ہوئی اور سوشلسٹ سماج کی تشکیل کا کام شروع ہو گیا۔ روسی انقلاب نے ایسے تمام ممالک کو متاثر کیا جو مارکسزم کو اپنانے کی تلاش میں تھے۔ دوسری طرف بورژوا طبقہ ان اثرات کو ضائع کرنے میں کوشاں رہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کروڑوں کی تعداد میں لوگوں نے سامراجیت کے خلاف جدوجہد کی اور دنیا کے کئی ممالک میں سوشلسٹ نظام قائم ہوا۔ عالمی سوشلزم عالمی نظام سرمایہ دارایت پر حاوی ہو گیا جس سے انسانی ترقی کی تمام راہیں ہموار ہو گئیں۔ بقول وہاب اشرفی:

صدیاں لینن اور مارکس کے تصورات سے فائدہ اٹھاتی رہیں گی اور مارکسی تصورات کو لازماً کوئی نہ کوئی نہج ملتی رہے گی۔ آنے والی نسلوں کو سرمایہ داروں کی چالوں کی خبر ہوتی رہے گی۔ اور جنگ کی بدبختیاں کیا رنگ لاتی ہیں۔ ان کا بھی احساس ہوتا رہے گا لیکن ہمیشہ یہ بات یاد رکھی جائے گی کہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء کا عظیم انقلاب لینن کی راہ اپناتے ہوئے کس طرح دنیا میں پہلی سویت ریاست کے قیام کا باعث ثابت ہوا جس کے نتائج ہمیشہ غیر معمولی ثابت ہوتے رہیں گے۔ ۵

مارکس کو اپنی زندگی میں بہت سے مصائب کا سامنا رہا۔ مالی لحاظ سے بھی اس نے مشکل حالات دیکھے لیکن پھر بھی اس نے اپنے نظریات سے روگردانی نہیں کی۔ سبط حسن لکھتے ہیں۔

جس وقت مارکس نے وفات پائی تو دو ہی گز زمین اس کی ملکیت تھی۔ جس میں وہ دفن ہوا۔ مگر آج ایک تہائی دنیا میں اس کے انقلابی اصولوں پر عمل ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اینگلز نے مارکس کے جنازے پر تقریر کرتے ہوئے سچ کہا تھا کہ مارکس کا نام سدا زندہ رہے گا اور اُس کا کام بھی۔ ۶

۲ دسمبر ۱۸۸۱ء مارکس کی بیوی کی وفات کے بعد مارکس پر دکھ کا پہاڑ ٹوٹا اور کچھ ہی عرصے بعد اس کی بیٹی بھی فوت ہو گئی اس طرح اس کی طاقت روز بروز جواب دینے لگی۔ ۴ مارچ ۱۸۸۳ء میں مارکس اپنی مطالعہ گاہ میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ ۷ مارچ ۱۸۸۳ء کو لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں دفن کیا گیا۔ وہ عظیم دل جو کڑوروں لوگوں کے دلوں کی آواز تھا۔ وہ دھڑکنا بند ہو گیا۔

مارکسزم کے اجزائے ترکیبی

مارکسزم محض ایک فکر اور خیال کا نام نہیں بلکہ اس کی بنیاد ایک باقاعدہ نظام فکر پر استوار ہے۔ اس مظام فکر کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں۔

جدلیاتی مادیت

انیسویں اور بیسویں صدی کا دور جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کا دور تھا۔ "مارکس نے معاشرتی ارتقا کی وضاحت کے لیے جدلیاتی طریق سے کام لیا ہے۔ جدلیات ہیگل کے فلسفے کا نہایت اہم جز ہے۔" ۷ جس میں مزدور کسان

،کاریگر، تمام لوگ شامل تھے۔ ایسے میں عوام کی آواز کارل مارکس، فیڈرک اینگلز اور وی آئی لینن کے نظریات بنے ہوئے تھے۔ مارکس اپنے تعلیمی زمانے سے ہی مشہور جرمن فلسفی جارج ہیگل کے فلسفیانہ افکار سے بے حد متاثر تھا۔ ہیگل نے جدلیاتی سائنس کو تاریخ میں پہلی بار ایک جامع فلسفیانہ نظام کی شکل میں پیش کیا۔ مارکس اور اینگلز نے ہیگل کے فلسفہ پر تنقید کی اور پہلی بار جدلیاتی مادیت کے تصور کو سائنسی شکل فراہم کی اس حوالے سے اینگلز لکھتا ہے:

> مارکس اور میں ہی غالباً وہ لوگ تھے جنہوں نے باشعور جدلیات کو (عینیت کے ہاتھوں تباہی سے، جس میں ہیگالیت بھی شامل ہے) بچایا اور اس کا اطلاق فطرت کے مادی تصور پر کیا۔[8]

مارکس بھی ہیگل کی طرح حقیقت کو جدلیاتی مانتا ہے یعنی حقیقت متحرک اور مائل بہ ارتقا ہے۔ ایک ہیئت اپنی تردید کرتی ہے اور اس تردید سے نئی ہیئت جنم لیتی ہے۔ زندگی بھی اسی طرح ایک پیہم اور بے پایاں تکون ہے۔ جس کے لئے تحریک لازمی ہے۔ ایک نئی صورت کے وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے پہلے والی صورت مٹ جائے مگر مارکس حقیقت کو مادہ بتاتا ہے۔ مادہ جامد نہیں۔ ہیگل نے جدلیات کو وجود مطلق یا روح مطلق تک ہی محدود کر دیا تھا۔ لیکن مارکس نے اس کا رشتہ مادیت سے جوڑ کر اس میں نئے انقلابی معنی پیدا کر دیے، چنانچہ ایک جگہ مارکس نے لکھا ہے: "ہیگل کے ہاتھوں جدلیات پر اسرار ضرور ہوئی لیکن اس کے باوجود ہیگل ہی وہ پہلا شخص تھا۔ جس نے جدلیات کی حرکت کی عام شکلوں کی جامع اور باشعور تصویر پیش کی۔ اس کے یہاں جدلیات اپنے سر کھڑی ہے، اسے پیروں پر کھڑی کرنا چاہیے تاکہ اس پر اسرار خول کے اندر معقول مغز دریافت کیا جاسکے "[9] مارکس ہیگل کے فلسفے کے نفس مضمون سے کم اور اس کے طریقہ کار سے زیادہ متاثر تھا۔ مارکسی فلسفہ کے مطابق مادہ ایک خارجی حقیقت ہے جو ہمیشہ وجود میں رہتی ہے۔ یہ انسانی دماغ سے الگ ہے مگر اس کا عکس ہمیں انسانی دماغ میں ضرور ملتا ہے۔ اسی لئے مارکسزم فطرت کو مادی تسلیم کرتا ہے۔ اس کی نظر میں انسان کے وجود سے پہلے ہی فطرت موجود تھی۔ اس لیے یہ انسان اور انسانی سماج کی مادی بنیادوں کو فطرت کا ہی ایک حصہ تسلیم کرتی ہے۔ اس لیے انسان کے وجود میں آنے کو دنیا کے ارتقائی عمل میں ہی تلاش کرنا چاہیے۔ انسان اس عالم سے وجود میں آیا جو اس سے پہلے ہی موجود تھی۔ جدلیاتی مادیت کے بارے میں اینگلز کے مطابق:

> دجدلیاتی فلسفے کے نزدیک کوئی بھی حقیقت آخری مطلق اور مقدس نہیں ہیں بجز خوب سے خوب تر کی لازوال جستجو کے "اور" فن کا سفر ہمیشہ انجانی دنیاؤں میں ہوتا ہی اور ہر فنکار ان

دنیاؤں میں پہنچے کا راستہ خود منتخب کرتا ہے۔ اور ایسے شاہکار تخلیق کرتا ہے جو دوسروں سے
مختلف ہی نہیں دوسروں کے لیے ناقابل نقل بھی ہوتے ہیں۔ ۱۰

جدلیاتی فکر کا بنیادی نکتہ یہ نہیں کہ یہ تبدیلی اور حرکت کے تصور کی بنیاد پر قائم ہے بلکہ اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حرکت اور تبدیلی کی بنیاد تضاد اور کشمکش پر ہے۔ مارکس کے مطابق جدلیات "بیرونی دنیا اور انسانی غور و فکر دونوں کے عام قوانین حرکت کی سائنس ہے۔ ۱۱ دیکھا جائے تو جدلیات نہ تو فکشن ہے اور نہ ہی تصوف بلکہ یہ ایک سائنس ہے۔ جس کے ذریعہ پیچیدہ اور طویل اعمال کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخی مادیت

تاریخی ارتقاء کو سمجھنے اور جاننے کے لیے مارکسی سائنس کے اطلاق کو تاریخی مادیت کا نام دیا گیا ہے۔ مارکس کے مطابق "انسانوں کا شعور انسان کے وجود کا تعین نہیں کرتا، بلکہ اس کے برعکس انسان کا سماجی وجود اس کے شعور کا تعین کرتا ہے۔ "۱۲ مارکس کے نظریہ کے مطابق انسان کی ضرورتیں ہی اس کو غور و فکر کرنے، آلات و اوزار ایجاد کرنے، قدرتی وسائل کو استعمال میں لانے اور زندگی کو بہتر بنانے پر، الغرض انسان کو محنت کرنے پر اکساتی ہیں جس سے وہ معاشرے کو بہتر سے بہتر بناتے ہیں۔ اینگلز نے تاریخی مادیت کے متعلق لکھا تھا کہ مادیت اپنی ارتقائی شکل میں مختلف مراحل سے گزری ہے۔ ہر عہد میں اس کے کچھ نہ کچھ انکشافات ہوتے رہے ہیں اور یہ اپنی صورت یعنی Form بھی بدلتی رہی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب سماج ایک طرح سے خاص طبقوں کو غلام بنائے ہوئے تھا۔ کئی لوگ ایسے تھے جو ایسے ہی اصول کے تابع رہے تھے۔ انسان اپنی فطرت کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ اس بات کا انداز اس کی پیداوار کے عمل سے لگایا جا سکتا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کے اس کے سماجی تعلقات کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے اور ان کے نتیجے میں کس قسم کے ذہنی تصورات و افکار جنم لیتے ہیں۔ تاریخی مادیت کے مطابق اپنی زندگیوں کی سماجی پیداوار کے دوران افراد ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رشتوں میں بندھ جاتے ہیں جو ناگزیر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات کے تابع بھی نہیں ہوتے۔ یعنی وہ پیداواری رشتے جو مادی پیداواری قوتوں کی ترقی کی اس مخصوص سطح سے میل کھاتے ہیں۔

مارکس کے نظریات

مارکسزم ایک ایسی فکر ہے جو ہمیں انسان اور انسانی سماج کی تاریخ واقعات، حالات جاننے اور انھیں بہتر بنانے کے اصولوں سے متعارف کراتا ہے۔ مارکسزم اصل میں سائنسی علوم کی طرح انسانی سماج کے ارتقا کا علم ہے۔ جو سرمایہ داری نظام کے خاتمہ اور سوشلزم اور کمیونزم کے قیام کی نوید دیتا ہے۔ مارکسی سائنسی اصولوں کی سماج میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ان اصولوں کو معاشرے سے فراموش نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح جس طرح کائنات میں دن رات کا بدلنا تبدیل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹ویں صدی کے وسط میں کارل مارکس نے اپنے رفیق کار فریڈرک اینگلز کی مدد سے سائنٹیفک نظریہ کی بنیاد رکھی۔

مارکس کے مطابق اس کے نظریات اقتصادیات، تاریخ اور سماج کے مسائل سے مل کر وجود میں آئے ہیں۔ مارکس کے نظریہ سے پہلے یہ بات لوگوں کی نظر سے اوجھل تھی کہ سیاست سائنس اور آرٹ وغیرہ کی خدمت کرنے سے پہلے انسان کو پینے کے لئے پانی اور پیٹ بھرنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے۔ ان ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے انسان دوسرے انسانوں سے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہے۔ مارکس نے ان نظریات کی مدد سے سرمایہ دارانہ نظام کو جانچا، پرکھا اور اس سے نئے نظام کی نشان دہی کی۔ مارکس کی معاشی اور سماجی مسائل سے بھرپور لگن نہ صرف جرمنی کے عوام کی تکلیف دہ بدحالی اور محرومی دیکھ کر جاگی تھی بلکہ نہایت ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں برطانیہ اور فرانس کے حالات وواقعات سے بھی ابھری تھی اور اس کے اثرات پوری دنیا نے قبول کیے۔

مارکس اور اینگلز کے مطابق انسان دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک طرف سرمایہ دار ہیں اور دوسری طرف مزدور ایک طبقہ ظالم اور دوسرا مظلوم ہے۔ مزدور طبقہ وہ واحد طبقہ ہے جو نجی ملکیت سے مکمل عاری ہے سب سے زیادہ منظم اور مظلوم ہے دوسری جانب ظالم سرمایہ دار طبقہ وہ واحد استحصالی ہے جس کے پاس نجی ملکیت اور پیداوار کا سر براہ ہے۔ مارکس کے سامنے یہ چیز واضح تھی کہ مزدور طبقہ کو صرف ووٹ کا حق مل جانے سے مسئلے کا حل ممکن نہیں کیونکہ ووٹ سے اقتدار تو ظالم طبقے کے پاس ہی رہتا ہے۔ اس لیے مارکس نے نئے ابھرتے طبقے کو اپنے زور بازو پر

اقتدار حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔مارکس ہی وہ شخص تھا جس نے مزدور طبقہ کو سرمایہ دار طبقے کے استحصالی راج سے نجات دلائی اور انسانی معاشرے سے انسان کے ہاتھوں انسان پر ظلم کی ہر شکل کا خاتمہ کر کے ایک حقیقی خوشحال معاشرہ قائم کیا۔مارکس نے ہی سیاست میں مزدوروں کی پہلی بین الاقومی کمیونسٹ تنظیم بنائی۔مارکس کا تعلق یورپ کے صنعتی دور سے تھا اس لیے اس نے تاریخی ارتقاء کے قانون کا اطلاق اپنے عہد کے معاشی نظام اور اس سے پیدا ہونے والے معاشرے سے کیا۔مارکس نے قدر زائد کا نظریہ پیش کیا جس میں سرمایہ داری استحصال کا سارا بھید کھول دیا۔قدر زائد سے مراد وہ فرق ہے جو مزدور کی پیدا کی گئی قدر اس کی قوت محن کی قدر کے مابین ہے جس سے مراد اجرت ہے۔مزدور کا دن میں کام کا دورانیہ دو حصوں پر تھا جس نے ایک حصے میں وہ اپنی اجرت کے لیے کام کرتا اور دوسرے میں سرمایہ دار کے لیے قدر پیدا کرتا اس طرح سرمایہ دار طبقہ مزدوروں کی محنت کو پورا معاوضہ ادا نہیں کرتا۔مارکس نے قدر زائد کا نظریہ پیش کر کے سرمایہ دارنہ استحصال کی ساخت کو ننگا کر دیا۔اس طرح پرولتاری اور بورژوای طبقے کے مابین نزاع کی اقتصادی بنیاد بھی واضح ہو گئی۔مارکس نے معاشی ضروریات کی تسکین کو انسانی ارتقاء کے ساتھ وابستہ کیا اور انسان کی محنت کو بنیادی عنصر کے طور پر لیا۔معاشی ضرورتیں انسان کو غور و فکر کرنے پر راغب کرتی ہیں۔آلات و اوزار ایجاد کرنے، قدرتی وسائل کو استعمال میں لانے اور زندگی کو بہتر بنانے پر اکساتی ہیں۔جس سے انسان معاشرے کو بہتر سے بہتر بناتا رہتا ہے۔مارکس کے مطابق انسان کے شعور اور اس کے حالات زندگی میں جدلیاتی ربط ہے۔یعنی اس کی سوچ اس کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔اس کے خیالات، رویے اور رجحانات جو وہ اپناتا ہے وہ سب اس کی تربیت اس کے ماحول سے سیکھے ہوئے ہوتے ہیں۔مارکس کا مشہور قول ہے کہ انسان کا شعور اس کے سماجی وجود کا تعین نہیں کرتا ہے بلکہ اس کا سماجی وجود (سماجی حالات اور سماجی رشتے) اس کے شعور کا تعین کرتا ہے۔[۱۳]

حقیقی دنیا وہی ہوتی ہے جس کا وجود حقیقت میں ہو۔ہماری خارجی دنیا ایک حقیقی چیز ہے۔خیالی نہیں وہ ہمارے ذہین اور خیال سے آزاد ہو کر وجود رکھتی ہے۔جس کا ہمیں شعور ہو یا نہ ہو وہ موجود ہے۔اس کی حرکت اور ارتقا کچھ قوانین کا پابند ہے۔ان قوانین کو انسان اپنے علم سے معلوم کر کے اپنی ضروریات کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔لیکن یہ قوانین پختہ ہیں اور کوئی شخص ان کو بدل نہیں سکتا۔مارکسزم نے اپنے تمام نظریوں کی بنیاد دنیا کے مادی تصور پر رکھی ہے۔جس سے وہ ساری دنیا کا جائزہ لیتی ہے اور ان قوانین کو پرکھتی ہے۔جو اس کائنات میں کام کرتے ہیں۔انسان

بھی کائنات کا ایک جزو ہے۔ انسانی سماج کس طرح بدلے گا؟ سماج کے مطالعہ سے نئے قوانین دریافت کئے جاتے ہیں۔ پھر ان کو پرکھا جاتا ہے جو نتائج تجربات کی کسوٹی پر ٹھیک اترتے ہیں۔ وہ قانون ٹھیک تصور کیے جاتے ہیں اور جو ٹھیک نہیں اترتے ان میں ترمیم کی جاتی ہے۔

مارکسی نظریات اور ادب

مارکسزم جس کے اثرات پوری دنیا نے قبول کیے اور زندگی کا کوئی بھی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مارکسی نظریے نے ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ میں ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ سماجی، معاشی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی ان تمام سطحوں کو پر رکھتا ہے۔ ۱۴ مارکسزم کے اثرات تمام علوم و فنون پر مرتب ہوئے۔ مارکسیت نے زندگی کے بارے میں مخصوص نظریہ پیش کیا جس کی نوعیت ہمہ گیر ہے اور اس کا اطلاق انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی ہوتا ہے۔ شاعر ادیب معاشرے کا حساس طبقہ ہے جن نے مارکسزم کے اثرات جلد قبول کر لیے اور اپنی شاعری اور تحریروں میں بھی اس کا ثبوت پیش کیا۔

مارکسی نظریے کے مطابق ادب سماج کو اور سماج ادب کو متاثر کرتا ہے۔ کیوں کہ ادب سماج کے بدلتے حالات و واقعات سے اثرات قبول کرتا ہے اور اس کی جھلک پھر ہمیں اس کے فن پاروں میں دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن تحریر کرتے ہیں:

> ادب بھی انہی تصورات کا ایک حصہ ہے۔ گو ادب فلسفہ کی طرح نظریہ یا "تصور" نہیں ہے لیکن وہ تمام احساسات و جذبات، اقدار و تصورات جو ادب میں جلوہ گر ہوتے ہیں، اپنے دور کی سماجی حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں اور یہ سماجی حقیقتیں دراصل ہر دور کے ایسے بے نام اور بے زبان لاکھوں کڑوڑوں مظلوم عوام کی ضرورتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا ادب کا رشتہ سماجی تانے بانے سے جڑا ہوا ہے اور ادب کے تصورات ہی کو نہیں طرز بیان، تشبیہوں اور تمثالوں کو اسی سماجی ڈھانچے کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱۵

ادب جس بھی دور میں تخلیق کیا گیا ہو وہ اس دور کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعر ادیب اپنے زمانے کے حالات وواقعات کو باریک بینی سے محسوس کرتے ہیں جس سے ذہن کی داخلی کیفیات پروان چڑھتی ہیں۔ اس کی وجہ سے جذبات و احساسات ابھرتے ہیں۔ اور اسی سے سماجی محرکات ترتیب پاتے ہیں۔ ادب میں مارکسی نقطہ کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ یہ معاشرتی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ مارکسزم میں حقیقت کی تلاش اور جستجو کی لگن ہمیشہ کار فرما رہتی ہے۔ مارکسی نقطہ نظر ترقی پسند اور حقیقت پسند ہے۔ اس کا رجحان حال اور مستقبل کو روشن کرنے کی کوشش میں ہے۔ مارکسی نقطہ نظر ادب اور زندگی کے بارے میں ایک منفرد انداز فکر کا حامل ہے۔ جس میں ادب کا مقصد زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری ادب اور زندگی کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقہ سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لیے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے کیوں کہ ادب پیغمبری کی طرح خود گزاری کا متقضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور ماضی، حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لیے ضروری ہے تا کہ اس کی دردمندی رائیگاں نہ جائے اور تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے۔ پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے۔ جب اس کی آگ میں تپا جائے اور اس کے ہنگاموں میں حصہ لیا جائے۔ اس کی تگ ودو سے الگ رہ کر اس رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگایا۔ اس صورت میں نہ ایک زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیام ان تک پہنچا سکتا ہے۔ ۱۶

مارکسی ادب سے مراد ایسا ادب ہے جس نے انسان کو جبر، ظلم، بربریت اور محرومیت سے آزاد کیا ہو اور انسان کے لیے آسانیاں اور حسین لمحات پیدا کیے۔ یہ چیزیں تب ہی ممکن ہو سکتی ہیں جب معاشرے میں جاگیر دارانہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور سامراجی نظام نہ ہو جہاں ظلم و ستم، قتل و غارت گری اور مزدور طبقہ کا استحصال نہ کیا جائے۔ مارکسی نقطہ نظر بھی اسی ادب کا کایل ہے۔ مارکسی نظریات ایسے ادب کی ترویج کرتے ہیں۔ جس میں حقیقت پسندی اور جدیدیت کے پہلوؤں کو عیاں کرنے کی سعی کی گئی ہو۔ پروفیسر ممتاز حسین اس حوالے سے میں رقم طراز ہیں:

دنیا کا وہ سارا ادب زندہ رہے گا جس نے انسان کی فطرت کے جبر، انسان کے جبر اور زندگی کے غلط تصورات سے آزاد ہونے میں مدد پہنچائی ہے اور وہ سارا ادب طاق نسیاں بن جائے گا جس نے غلامی کو کسی بھی راستے میں منطقبانے کی کوشش کی ہے خواہ وہ کوشش غیر شعوری ہی کیوں نہ ہو۔[۱۷]

مارکسی نقطہ نظر نے ادب اور سماج کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا جس کی بنا پر سماج میں موجود حقیقت پسندی کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مارکسی ادب عام انسانوں کی زندگی سے وابستہ ہے اور یہ عام آدمی کی زندگی کے سیاسی، معاشی، سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو عیاں کرتا ہے۔

اردو ادب میں مارکسزم کی روایت:

۱۹۳۰ء کے عالمی اقتصادی بحران، جرمنی کے نازی ازم، اٹلی اور سپین کے فاشزم، برصغیر پر انگریزوں کے قبضے اور ۱۹۱۷ء کے عظیم انقلاب روس نے برصغیر کے نوجوانوں کے اندر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نہ صرف نفرت پیدا کر دی بلکہ اس نظام کے خلاف جدوجہد پر بھی اکسایا۔ کارل مارکس، اینگلز، لینن اور ماؤ کی تحریروں نے ان کے انداز غلامی کے خلاف بغاوت اور غیر طبقاتی سماج کے قیام کا طریق کار سمجھنے میں مدد دی۔ جدلیاتی مادیت، طبقاتی جدوجہد، کمیونزم اور عالمگیریت جیسے موضوعات پر بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ مارکسی نظریہ جہاں دوسرے مکاتبِ فکر پر اثر انداز ہوا ہے۔ وہیں اردو ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شاعروں اور ادیبوں نے ان اثرات کو جلدی محسوس کر لیا اور اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعہ مظلوموں کی حمایت اور سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت شروع کر دی۔ مارکسی دبستان نے ایسی تخلیقات کو منظر عام پر لانا وقت اور حالات کے لیے ضروری سمجھا جو مزدوروں کی سمجھ سے بالاتر نہ ہوں۔ اس لیے اس میں سیدھے سادے، بیانیہ اور سپاٹ پلاٹ پر زور دیا گیا۔ ادیبوں اور شاعروں کی پوری ایک جماعت اس فکر کی علمبردار بن کر ابھری اور روسی زبان میں مزدوروں اور مجبوروں کو مخاطب کرنے لگی۔ بعد ازاں آہستہ آہستہ اس کے اثرات دیگر یورپی اور ایشیائی زبانوں پر پڑنے لگے۔ اردو ادب میں سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اس تحریک کو متعارف کرایا۔ پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں سجاد ظہیر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، محمد دین تاثیر وغیرہ بھی شریک تھے۔ انہوں نے لندن میں ترقی پسند تحریک کا ایک خاکہ تیار کیا

اور وہاں ترقی پسندی کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۳۲ء میں انگارے کے نام سے افسانوں کا مجموعہ اپنی ادارت میں شائع کرایا۔[۱۸] ۱۹۳۲ء میں ترقی پسند پہلی کل ہند کانفرنس لکھنو میں منعقد ہوئی جس کی صدارت افسانہ نگار منشی پریم چند نے کی۔ پروفیسر کمال احمد صدیقی نے کہا تھا:

> اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونا چاہیے کہ ترقی پسندی کی تحریک جن اقدار کو ادب میں فروغ دینے کے لیے وجود میں آئی وہ اقدار وہی ہیں جن کا علمبردار کارل مارکس تھا۔
> ص[۱۹]

ادب لطیف میں ۱۹۳۶ء سے شائع ہونے والی اکثر تخلیقات ترقی پسند رجحانات کو ظاہر کرنے لگیں۔[۲۰] تحریک کے زیر اثر بہت سا شعری و نثری ادب تخلیق ہوا۔ افسانے کی صنف کو عروج ملا اور تنقید کا ایک نیا مکتبہ فکر معرض وجود میں آیا۔ ترقی پسند شعرا میں فیض، فراق، علی سردار جعفری، احسان دانش، اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کے نام نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری نے بھی مارکسی واشتراکی فکر کا پرچار کیا۔ اردو افسانے پر ابتدا سے ہی مارکسی نظریات کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ابتدائی افسانہ نگاروں میں پریم چند کا نام بہت اہم ہے۔ منشی پریم چند نے غربت اور افلاس میں آنکھ کھولی تھی۔ جب انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تو انھوں نے بنیادی انسانی قدروں کا پرچار کیا۔ ان کے افسانے ایک عام انسان کی جذباتی اور فکری کشمکش کا حسین امتزاج معلوم ہوتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں ہندوستانی معاشرہ اپنے حقیقی روپ میں نظر آتا ہے اور انہوں نے انسانی عظمت اور محنت کو بلند مقام عطا کرنے کی سعی کی۔ ان کے ہاں حکمرانوں سے نفرت کے اظہار کا رویہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ان کا پہلا مجموعہ سوز وطن کی کہانیوں میں وطن اور قوم کے ساتھ محبت، بے لوث جذبے اور عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے غلامی سے نجات کو ترجیح دی۔ پریم چند کو بعد میں احساس ہوا غلامی سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ قوم کی نجات کے لیے معاشی بدحالی، جہالت، فرقہ پرستی، چھوت چھات، توہم پرستی جیسے مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ احوال و آثار کی پوری خبر رکھتے تھے اور انہوں نے زندگی کی سچائیوں کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے غریب اور مفلس عوام کو ذہن میں رکھا اور سماجی ناہمواریوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جس طرح سماج نے انسان اور انسانوں میں تفریق قائم رکھی ہے اور لوگوں کو طبقاتی

کشمکش میں ڈال رکھا ہے اس کا احساس ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ پریم چند نے عوام کے دکھ درد سے گہرا رشتہ قائم رکھا جس کی مثال ان کی تخلیقات سے ملتی ہے۔ "سنگرام" کے اندر طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے۔ ایک اور مثال "اسرار معابد" جس میں فرسودہ رسم ورواج اور مذہب کے نام پر معصوم انسانوں کے استحصال کو سامنے لایا گیا۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات کے اندر معاشرتی ناہمواریاں نظر آتی ہیں۔ جن میں "سوز وطن"، "پریم چالیسی"، "آخری تحفہ"، "زادراہ"، "دودھ کی قیمت" اور "واردات" شامل ہیں۔ "افکار تازہ" کے بارے میں سبط حسن نے کہا تھا اس کی مراد سیاسی یا اقتصادی آزادی نہیں بلکہ تخلیقی عملی کی آزادی یعنی بشری آزادی تھی ۲۱

پریم چند کے افسانوں میں شاہکار افسانہ "کفن" ہے اردو افسانہ کے ارتقائی سفر میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ "کفن" پر اظہار خیال کرتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں۔ اس میں ایک لفظ بھی بے کار نہیں۔ ایک نقش بھی دھندلا نہیں، شروع سے آخر تک چستی اور تلوار کی سی تیزی اور صفائی ہے۔ پریم چند نے ایک مرتبہ تو حقیقت کو مردانہ وار دیکھا ہے۔ ۲۲

اس میں کوئی شک نہیں "کفن" ان کا بہترین افسانہ ہے جس کے اندر پختگی، اور فنی صلاحیت موجود ہے۔ ان کے دیگر افسانوں میں بھی اسی طرح کی مردانہ وار حقیقت کی عکاسی ملتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

ترقی پسندوں کی فہرست میں راجندر سنگھ بیدی کا نام بھی بڑی اہمیت کا حاصل ہے۔ ان کے ہاں ہمیں مارکسزم کے اثرات نظر آتے ہیں۔ بیدی ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہم نے نہ مارکسزم پڑھا تھا نہ کچھ، لیکن ترقی پسندی اس لیے تھی کہ ہم عکاسی کرتے تھے اس زندگی کی جو زندگی ہم جی رہے تھے۔ ہماری ہمدردی پسے ہوئے پسماندہ طبقے کے ساتھ تھی۔ ۲۳

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں معاشرے میں رائج طبقاتی امتیازات اور ان کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ہمیں "تلادان" کے افسانے میں نظر آتی ہے۔

بیدی کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کا ماحول ملتا ہے، اس کے مسائل اس کی معاشرت کے مصائب ملتے ہیں۔ نچلے متوسط طبقے کی زندگی جو ہمیشہ تباہی کے غار پر ایک دھاگے سے لٹکی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی درد اور دہشت ملتی ہیں۔ انھوں نے اس درد اور دہشت کا اچھی طرح مشاہدہ کیا اور ان انسانی تکالیف کو خود بھی محسوس کیا اس کی جھلک "بھولا" افسانے میں ملتی ہے۔ نچلے متوسط طبقے کی خانگی زندگی کا نقشہ شاید ہی کسی نے ایسا کھینچا ہو۔ "کیوں کہ نچلے اور متوسط طبقے کی معاشی الجھنوں اور مشکلاتوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ ۲۴" اس لیے اس کی شکل ہمیں "گرم کوٹ" میں نظر آتی ہے۔ نچلے متوسط طبقے کے مسائل ان کے اور افسانوں میں بھی ملتے ہیں۔ جیسے "من کی من میں"، "لچھمن"، "گرہن"، "رحمن کے جوتے"، "ہڈیاں اور پھول" وغیرہ شامل ہیں۔

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی اردو کی نامور خاتون افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مشاہد گہرا ہے وہ اپنے معاشرے کی ناہمواریوں اور اس معاشرے کے پروردہ لوگوں کے نفس کی گہرائیوں پر بھی نظر رکھتی ہیں اور اپنے افسانوں میں بے حد فن کارانہ انداز میں ان کا اظہار کرتی ہیں۔ جس کی مثال ہمیں "کلیاں"، "چوٹیں" اور "ایک بات" میں ملتی ہے۔ اس کے بہت سے افسانوں میں سماجی اور جنسی حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ مولانا صلاح الدین نے عصمت چغتائی کے بارے میں لکھا ہے:

> یہ ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے صنف نازک میں سے ایک ایسی لکھنے والی میسر آئی جس نے نہ صرف اس روایتی بناوٹ، تکلف اور خوف کو یکسر دور کر دیا جس نے اس طبقے کی روح کو دبا رکھا تھا بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور حق پرستی سے ہمیں انسانی فطرت کی ان نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں بھی مدد دی جن تک تیز سے تیز مرد صاحب قلم کی رسائی محال نظر آتی ہے۔ ۲۵

عصمت چغتائی کے افسانوں میں ایک اہم چیز انسانی رشتوں کا احساس ہے۔ جو ان کے بیشتر افسانوں میں ملتا ہے۔ ان افسانوں کہ کرداروں کے رشتوں سے الگ خارجی حالات اور ماحول کے تغیرات و اثرات کے ساتھ ساتھ ان کی

خوشیوں اور غموں، محبتوں اور نفرتوں کے درمیان انسانی رشتوں کی دریافت وہ بے حد فطری انداز میں نظر آتی ہے۔ اس کی مثال ان کے افسانہ "احساس" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اوپندر ناتھ اشک

اوپندر ناتھ اشک ترقی پسندوں کی صف کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کے ہاں بھی مارکسی نظریات کی عکاسی دکھائی دیتی۔ ان کے افسانوں کے موضوعات کے اندر بھی نچلے متوسط طبقے کے مصائب، مسائل خرابیاں، پریشانیاں نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں نچلے طبقے کی عورت کے ساتھ عدم مساوات اس کی تشنگی اس کی بے بسی واضح نظر آتی ہے۔ جیسے "کونپل"، "قفس"، "چٹان"، "چیستن" کی ماں شامل ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے متوسط طبقے کی سماجی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے مزدور طبقے کے مسائل کے متعلق جو افسانے لکھے ان میں بڑا درد اور طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے۔ جس کی مثال "وہ میری منگیتر تھی"، "تین سوچوبیس" اور "کاکڑاں کا تیلی" وغیرہ میں ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کے اندر سماج کے پس ماندہ نچلے طبقے اور متوسط طبقے کی زندگی کا مشاہدہ بہت گہرائی سے ملتا ہے۔ کیوں کہ ان کی زندگی ان علاقوں کے اندر گزری جہاں اقتصادی تنگی جہالت گندگی اور بیماریاں زندگی کا حصہ ہوا کرتی تھی۔ اس کی مثال "تین سوچوبیس"، "وہ میری منگیتر تھی"، "اُبال" وغیرہ میں ان طبقات کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔

حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری کا شمار ترقی پسند تحریک اردہ افسانے کے ایک اہم حوالوں میں ہوتا ہے۔ آپ صحافی ہونے کے ساتھ افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے۔ افسانہ نگاری کا آغاز ویسے تو ۱۹۳۰ء سے شروع کیا تھا۔ مگر ان کے نظریاتی اور فکری اعتبار سے پختہ افسانے آزادی کے بعد کے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "انوکھی مصیبت"، "بھرے بازار میں" اور "شکستہ کنگورے" مشہور ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے بہت سارے اچھے افسانے اردو ادب کو دیئے۔ جن میں ان کا لازول افسانہ "آخری کوشش" ہے۔ اس افسانے کی شہرت کافی زیادہ ہے۔ ان کے افسانے "بھرے بازار میں"، "انوکھی مصیبت"، "پرواز، ڈھائی سیر آٹا"، "کمزور پودا"، "ادایا قضا" مارکسی ادب کے نمائندہ افسانے کہا جا سکتا ہے۔

حیات اللہ انصاری نے مارکسی ادب کے سماج کے ان افراد کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی جو زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن اندر سے ٹوٹ چکے ہیں۔ ان کرداروں کی حالت نچلے طبقوں سے بھی بری ہے۔ "حیات اللہ انصاری کے ہاں موضوعات کا تنوع، باریک بینی اور زبان کے ورتارے میں متین لہجہ خصوصیت کا حامل ہے۔۲۶"

اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور سماجی رویوں کے نشیب و فراز کا رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

ہاجرہ مسرور

اردو افسانے کی تاریخ میں خصوصاً مارکسی تحریک سے وابستہ لکھنے والی خواتین افسانہ نگاروں میں ہاجرہ مسرور کا نام اہم سمجھا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں درد کی ایک لہر محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے ماحول سے مواد اور موضوع لیتی ہیں انھیں اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے پیش کرتی ہیں۔ گھریلو عورتوں اور گھریلو مسائل کے بارے میں ان کا مشاہدہ وسیع اور گہرا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات عام زندگی سے حاصل کردہ ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں واضح مقصدیت بھی نظر آتی ہے۔

انھوں نے متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کے دکھوں، غموں اور مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جہاں عام لوگوں سے ہمدردی کا اظہار نظر آتا ہے وہیں استحصال کے خلاف بغاوت بھی ہے ان کا دردمند دل ان لوگوں کے ساتھ ہے۔ جو سوسائٹی کے اصولوں پر زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے افسانے عوام دوستی اور انسان دوستی کی مثالیں ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "اندھیرا اجالے"، "کھیل" اور "ہائے اللہ" اس کی مثالیں ہیں۔ یہ مجموعے ترقی پسند نظریات کے حامل ہیں جن میں متوسط طبقے کے ساتھ ہمدردی محسوس کی جاسکتی ہے۔ سلیم اختر نے ہاجرہ مسرور کے متعلق لکھا ہے:

> ہاجرہ مسرور کے یہاں چیرہ دستیوں اور ماحول کے جبر کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ جو کبھی چیخ بن جاتا ہے تو کبھی بغاوت۔۲۷

بلاشبہ ہاجرہ مسرور اردو افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ جنھوں نے متوسط اور نچلے طبقے کے مسائل کو سمجھا اور اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

احمد ندیم قاسمی

مارکسی افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی اہمیت کا حاصل ہے۔ احمد ندیم قاسمی صحافی بھی تھے موصوف نے مزاحیہ کالم بھی لکھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے افسانہ نگاری سے بھی اپنا رشتہ استوار کیے رکھا۔ آپ کا پہلا افسانہ "بدنصیب بت تراش" ہے جس میں دیہات کا منظر آتا ہے۔ آپ کے اولین دو افسانوی مجموعوں میں "چوپال" اور "بگولے" میں پنجاب کے دیہاتوں کی حقیقی زندگی کی موثر عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں "زمین دار"، "جاگیر دار"، "سود خور مہاجن" اور "بیوپاری" موجود ہیں ان افسانوں میں ان لوگوں کی عکاسی کی گی جو محنت کش اور سادہ لوح دیہاتوں کی بے بسی اور جہالت سے فائدہ اٹھانے اور ان کا خون چوسنے کے لیے تیار ہیں۔ جبکہ سرمایہ دار اپنی فکر کی چالوں سے بازی لے جاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے ان افسانوں میں پس ماندہ دبے ہوئے ادبی طبقے کو تمام تر کمزوریوں، مجبوریوں، محبتوں اور نفرتوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کی مفلسی، جہالت اور بے حسی کی تصویریں پیش کی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دیہات اور اس کی زندگی کے ہر گوشے سے خوب واقف ہیں۔ دیہات کی فضا اور اس کی زندگی سے انہیں اتنی محبت ہے کہ وہ جذباتی طور پر اس سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح آپ نے بھی تقسیم کے خوفناک نتائج کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً "پرمیشور سنگھ" یا "جلسہ"، "بھری دنیا"، "میں انسان ہوں"، "دنیا فرہاد" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان نے عشق و محبت کے موضوعات کو نظر انداز نہیں کیا جیسے کہ "چوپال" اور "بگولے"، "جوانی کا جنازہ"، "لڑکی یا چھاگل"، "مسجد کے مینار" وغیرہ کی مثالیں ملتی ہیں۔ پریم چند کی حقیقت نگاری کو احمد ندیم قاسمی نے بھی اپنایا اور ترقی پسندوں کی فہرست میں اہم نام بنایا۔

حمراء خلیق

ان افسانہ نگاروں کی طرح حمراء خلیق بھی اردو افسانے کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ حمراء خلیق ۱۹۳۸ء میں دہلی کے لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد نے آپ کا نام فردوس حمراء رکھا تھا۔ حمراء خلیق کے دو بھائی اور چار

بہنیں تھیں۔ آپ سب سے چھوٹی تھیں اور آپ کا تعلق ایک ممتاز علمی ادبی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد محترم (صغیر حسن) دہلی کے سیکنڈری سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور وہ جو قیام پاکستان کے بعد بھی تدریسی شعبے سے منسلک رہیں۔ ان کی والدہ رابعہ پنہاں اردو، فارسی کی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ آپ کے پیدا ہوتے ہی آپ کو آپ کی خالہ آمنہ عفت اور خالو نے گود لے لیا کیوں کہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ حمراء خلیق کے خالو جنہوں نے انھیں پالا تھا وہ مظفر نگر کے نامی گرامی وکیل تھے اور لیاقت علی خاں کی جائیداد کے بھی وکیل تھے۔ خالہ میونسپلٹی کی ممبر تھیں اور وہ بھی شاعری کرتی تھیں۔ ان کے والدین کا قیام پاکستان کی جدوجہد میں لیاقت علی خان کے ساتھ اہم کردار تھا۔ علمی اور ادبی گھرانے سے تعلق کی وجہ سے حمراء خلیق نے بھی اپنے کالج کے زمانے سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

حمراء خلیق نے اپنی تعلیم کا آغاز چار سال کی عمر میں قرآن پاک سے کیا۔ اس کے بعد مظفر نگر کے ایک سکول سے میں داخل لیا۔ آپ نے گیارہ سال کی عمر میں ۱۹۴۹ء میں اپنے والدین کے ساتھ پاکستان کی طرف ہجرت کی اور یہاں آپ نے اپنی تعلیم دوبارا شروع کی۔ میٹرک کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا اور اس کے بعد آپ نے "لائل پور کالج فار ویمن" سے بی-اے کیا۔ حمراء خلیق نے اپنے سکینڈ ائیر کے امتحان کے بعد سے ہی کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے جو لاہور سے نکلنے والے " نور و نار "اور "چٹان" میں شائع ہوئے تھے۔۲۸ آپ نے پنجاب یونی ورسٹی سے ایم-اے، بی-ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ حمراء خلیق کو اپنے زمانہ ءطالب علمی سے ہی ادب سے لگاؤ تھا۔ جس کے لیے انھوں نے کالج کے زمانہ میں مختلف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ وہ ڈیبیٹنگ سوسائٹی اور ڈرامیٹک کلب کی سیکریٹری رہیں۔ آپ کو اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگزیری ادب سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔

۱۲ جولائی ۱۹۶۴ء میں آپ کی شادی ابراہم خلیق سے ہوئی۔ جو ڈیپارٹمنٹ آف فلمز اینڈ پبلیکیشنز میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائزے تھے۔ حمراء خلیق کے دو بیٹے ہیں۔ جن میں بڑے حارث خلیق جو شاعر بھی ہیں اور ان کے چھوٹے بیٹے طارق خلیق جو بزنس ریکارڈ اخبار میں جاب کرتے ہیں۔ حمراء خلیق نے اپنی زمانہ ءطالب علمی میں ہی لکھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ مختلف کہانیاں اور افسانے لکھتی رہیں لیکن انھوں نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز اپنے شوہر کی بیماری کے دوران کیا اس عرصے میں انھوں نے اپنی زندگی کی تمام مصرفیات کو چھوڑ کر صرف اپنے شوہر کا بیماری میں خیال رکھا اپنی آپ بیتی کہاں کہاں سے گزر گے میں اس حوالے سے وہ کہتی ہیں "ان کی بیماری کے دوران ان کے

کام کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے کچھ لکھنے پڑھنے کا سہارا بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ میں کبھی کبھی لکھ کر خلیق کو دکھاتی۔ وہ بے حد خوش ہوتے تھے۔ اور اکثر کہتے تھے "حمراء میں نے قلم چھوڑ دیا ہے اور تم نے اٹھالیا ہے" شاید ان کے اس جملے ہی نے میرے اندر ایک جذبہ ہمت اور امنگ پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے میں نے ان کے جانے کے بعد بھی قلم نہیں چھوڑا۔ حمراء خلیق کے انشائیے، افسانے اور تراجم معروف ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب منتخب افسانوں کے تراجم کا مجموعہ تھی یہ کتاب مشرق و مغرب کے افسانے کے عنوان سے ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آئی۔

مترجمہ کتب:

- مشرق و مغرب کے افسانے (عالمی ادب سے انتخاب) ۲۰۰۱ء
- نمکین چائے اور باقرخانیاں (کشمری لوک کہانیاں) ۲۰۰۳ء
- سنجوگ (موراگ مرے عبداللہ کے ناول "مائی خیبر میرج" کا ترجمہ) ۲۰۱۸ء
- کبوتر کی پرواز (رسکن بانڈ کے ناول "اے فلائٹ آف پنجر" کا ترجمہ) ۲۰۰۷ء

انشائیوں کا مجموعہ

- عورت ،گھوڑا اور سمندر ۲۰۰۶ء

آپ بیتی

- کہاں کہاں سے گزر گئے ۲۰۱۵ء

خاکوں کا مجموعہ

- گوشئہ دل ۲۰۲۰ء

رسائل جن میں تصنیفات اور تراجم شائع ہوئے

- نور ونار (لاہور)

- چٹان(لاہور)
- صحیفہ(لاہور)
- ماہِ نو(لاہور)
- عالمی ڈائجسٹ(کراچی)
- سب رنگ(کراچی)
- دنیا زار(کراچی)
- مکالمہ(کراچی)
- ارتقاء (کراچی)

حمرا خلیق نے مختلف ڈرامے بھی لکھے ان کے سب سے پہلے ڈرامے "جنگلی بوٹی" کی ہدایت سعد الدین نے کی جو اے۔ آر۔وائی پر دکھایا گیا۔[۳۰]

ٹی۔وی۔ڈرامے

- زبیدہ کی کہانی
- گاہک
- فیصلہ
- بھگت
- زندگی
- بارش
- تیسری لڑکی
- کیا کہا
- سنگ گراں ہے زندگی
- نہ کہیں جہاں میں اماں ملی

- جنگلی بوٹی (امرتا پریتم کی کہانی سے ماخوذ)
- دو ہاتھ (عصمت چغتائی کی کہانی پر مبنی)
- عجیب دکھن (آمنہ عفت کے ناولٹ پر مبنی)
- تعویذ (شفیق الرحمٰن کی کہانی سے ماخوذ)
- میں فون کرنے آئی تھی (گیبرئیل گارسیامارکز کی کہانی پر مبنی)

حمراء خلیق کی شخصیت کا ایک اہم حوالہ افسانہ نگاری بھی ہے۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں دو ترجمہ شدہ اور دو طبع زاد ہیں۔ ان کا پہلا طبع زاد افسانوی مجموعہ بعنوان مژگاں تو کھول ۲۰۰۴ء میں اکادمی بازیافت کراچی سے شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مجموعہ بادلوں کی اوٹ سے کے عنوان سے اکادمی بازیافت کراچی سے ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔ جن کا زیر نظر تحقیق میں جائزہ لیا جائے گا۔

حمراء خلیق کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا واضح بیانیہ ہیں۔ انہوں نے سادہ بیانیہ انداز میں بالکل عام انسانوں کی کہانیاں لکھیں، جن میں ان کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں معاشرتی ناہمواریوں کے علاوہ مارکسزم کی واضح عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں کے اندر ہمیں متوسط طبقے کے لیے ہمدردی، نظر آتی ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی سچائیوں کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے سماجی ناہمواریوں کو موضوعات بنایا کیوں کہ جس طرح سماج نے انسان اور انسانوں میں تفریق قائم کر رکھی ہے اور لوگوں کو طبقاتی کشمکش میں ڈال رکھا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے متوسط طبقے کی سماجی نفسیات کا مطالعہ کر رکھا ہو۔

حمراء خلیق کے زیادہ تر افسانے مارکسی کے نظریات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ حمراء خلیق کے افسانوں میں موجود مارکسی عناصر کے حوالے سے تاحال کوئی کام نہیں ہوا۔ چنانچہ اگلے ابواب میں حمراء خلیق کے افسانوں میں موجود مارکسی عناصر کا جائزہ لیا جائے گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ مصنفہ نے کس طرح سے مارکسی فکر کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے، اس کے محرکات کیا ہیں۔ اور ان کے کردار مارکسی رویوں سے کس حد تک آگاہ ہیں۔

مارکسزم نے زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نظریہ پیش کیا جس کی نوعیت ہمہ گیر ہے۔ مارکس ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کا خواہاں تھا جس میں ہر فرد کو معاشرتی آزادی ہو اور کسی کے حقوق کو سلب نہ کیا جائے۔ یہ تمام عناصر

ہمیں حمراء خلیق کے افسانوں میں بھی نظر آتے ہیں۔لہذا اس تحقیقی مقالے میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ کیا جائے گا اور اس حوالے سے کارل مارکس کے نظریات کو منتخب کیا گیا ہے۔کارل مارکس کے نظریات سے ایک نظری فریم ورک وضع کیا گیا ہے۔جس کی روشنی میں حمراء خلیق کے افسانوں میں موجود مارکسی رجحانات کا جائزہ لیا جائے گا۔اس کے نکات درج ذیل ہیں۔

۱. سرمایہ دارانہ معاشرے میں دو طرح کے طبقات بورژوا اور پرولتاری کا موجود ہونا۔

بورژوا طبقہ حرص و ہوس کا شکار اور معاشرے میں بر سر اقتدار ہوتا ہے۔یہ محنت کشوں اور غریب کسانوں کی محنت و مشقت کی وجہ سے سرمائے میں بہت مضبوط ہوتے ہیں۔

۲. بورژوا طبقے کا پرولتاریہ طبقے سے کم سے کم اجرت میں زیادہ سے زیادہ کام لینا۔

بر سر اقتدار ہونے کی وجہ سے وہ پرولتاریہ طبقے کے حقوق کو سلب کر لیتے ہیں۔اور ان کی ترقی کو روکنے اور کچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔بورژوا طبقہ کی ایک طرف دولت میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف پرولتاریہ طبقے کو اور بھی ستایا جاتا ہے۔

۳. بورژوا طبقے کو تمام مذہبی اداروں کی حمایت حاصل ہونا۔

۴. مارکس کے نظریے کے مطابق معاشرے کا ڈھانچہ دو حصوں میں منقسم ہونا:

- زیریں ساخت: اس میں مزدور، خام مال، پیداوار اور پیداواری شعبے کے حالات شامل ہوتے ہیں۔
- بالائی ساخت: معاشرے کے اس حصے کا پورے سماجی ڈھانچے (مذہب، قانون، میڈیا، سیاست) بنانے کا حق رکھنا۔

۵. مزدوروں کی ان کے شعبے میں عدم قبولیت، وہ اپنے شعبے کا جتنا بھی ماہر ہو جائے اس کی حیثیت مزدور کی ہی ہونا۔

ان مزدوروں کی محنت کے بل بوتے پر ہی بورژوا طبقہ بر سر اقتدار ہوتا ہے۔پھر یہ طبقہ حرص و ہوس کا شکار ہو جاتا ہے اور مزدور طبقے کو زندگی کے آرام و آسائش سے محروم کر کے ان کے جائز حقوق بھی سلب کر لیے جاتے ہیں۔

۶. مزدور کو اپنے شعبے میں کچھ تخلیق کرنے یا تبدیل کرنے کی اجازت کا نہ ہونا۔

مزدور طبقہ سے ہر طرح کے حقوق کو چھین لیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں اس طبقے کے لیے تحریکیں شروع ہوتی ہیں جن کے اندر ان محنت کش عوام کو ان کے جائزہ حقوق دلانے اور اشیاء کی پیداور کو ترقی پذیر راستے کی طرف لانے کی جدوجہد کی جاتی ہے ان کو روکنے اور کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۷. پرولتاریہ طبقے کی اجرت کا تعین بھی بورژوائی طبقے (زمیندر، دکاندار اور سرمایہ کار) کا ہی کرنا۔

پورژوائی طبقہ پرولتاریہ کی محنت کے سبب امیر تر ہو جاتا ہے اور دوسری طرف پرولتاریہ طبقہ غریب تر ہو جاتا ہے۔ ان کے گرد و پیش بیکاری، بیروزگاری، معاشی بدحالی کے اندھیرے میں پورا سماج ڈوب جاتا ہے۔ اور اس طرح اس ستم زدہ ہجوم کے صبر کا پیمانہ اتنا لبریز ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو آگے بڑھانے کے لیے اس طبقاتی جدوجہد میں آمادہ پیکار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس باب کے اندر مجموعی طور پر مارکسزم کے نظریات کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر ان نظریات میں سے کارل مارکس کے نظریات کی روشنی میں ایک فرم ورک واضح کیا گیا ہے۔ اس فرم ورک کے نکات کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ ابواب میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ کیا جائے گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ مصنفہ نے کس طرح سے مارکسی فکر کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے، اس کے محرکات کیا ہیں اور ان کے کردار مارکسی رویوں سے کس حد تک آگاہ ہیں۔

حوالہ جات

۱. جگن ناتھ آزاد،اقبال اور مغربی مفکرین(لاہور:مکتبہ جدید پریس، دسمبر ۲۰۱۶ء)،ص ۱۷۔

۲. سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک(کراچی:ملک نورانی مکتبہ دانیال وکٹوریہ چمبر ۲عبداللہ ہارون ،۱۹۷۷ء)،ص ۲۵۲۔

۳. پروفیسر محمد بشیر ترجمہ نگار،فلسفہ مغرب کی تاریخ(اسلام آباد:یورپ اکادمی مئی ۲۰۱۰ء)،ص ۸۸۸۔

۴. حمادرسول/ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد،"سبط حسن:مارکس اور مشرق "مشمولہ جرنل آف ریسریچ (اردو)،شمارہ ۱(۳۱دسمبر ۲۰۱۵ء)،ص ۱۳۶۔

۵. ہلال احمد وانی،مارکسزم اور اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔غیر مطبوعہ مقالہ پی۔ایچ۔ ڈی(سرینگر:شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی حضرت بل،۲۰۱۵ء)،ص ۹۲۔

۶. حمادرسول/ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد،"سبط حسن:مارکس اور مشرق،ص ۲۴۰۔

۷. ناصر عباس نیر،جدید اور مابعدجدید تنقید(کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان دسمبر ۲۰۰۴ء)،ص ۱۳۱۔

۸. پروفیسر وہاب اشرفی،مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ۲۰۱۹ء)،ص ۲۲۔

۹. کارل مارکس فریڈرک اینگلس ولادیمر لینن،مرزا اشفاق بیگ،(مترجم)،مارکسی فکر و فلسفہ کے خدوخال(لاہور:چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز،س ن ء)،ص ۱۱۶۔

۱۰. منظر اعظمی،اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ(لکھنو:اتر پر دیش اردو اکادمی ۱۹۹۶ء)،ص ۳۸۰۔

۱۱. پروفیسر وہاب اشرفی،مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب،ص ۲۲۔

۱۲. https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%D9%85%D8%A7%D8%B1%DA%A 9%D8%B3%DB%8C%D8%AA، تاریخ ملاحظہ ۲۵ فروری ۲۰۲۲

۱۳. ماہ رُخ/ڈاکٹر محمد ارشد اویسی،ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی،"مارکسی نظریہ اردو کے بنیاد گزار مارکسیادیب"مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو) ,شمارہ ۱(۳۱دسمبر ۲۰۱۸ء)،ص ۹۱۔

۱۴. محمد شوکت علی،"اردو ادب پر مارکسی اثرات"مشمولہ ادرک،شمارہ ۱(۳۰جون ۲۰۱۸ء)،ص ۱۹۵۔

۱۵. ڈاکٹر محمد حسن،مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ(نئی دہلی:اردو بیورو۲۰۰۰ء)، ص۳۰۷۔

۱۶. اختر حسین رائے پوری۔"ادب اور زندگی"مشمولہ:ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ترتیب و تدوین ڈاکٹر قمر رئیس / سید عاشور کاظمی،(لاہور:مکتبہ عالیہ،۱۹۹۴ء)،ص۱۶۱۔

۱۷. محمد شوکت علی،"اردو ادب پر مارکسی اثرات،ص۲۰۰۔

۱۸. شکیل حسین احمد رسول / شازیہ عنبرین ترقی پسند کے بنیاد گزار"مشمولہ تحقیق نامہ شمارہ۲۸(جنوری تا جون۲۰۲۱)،ص۱۵۸۔

۱۹. ڈاکٹر شفیق انجم،اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں(اسلام آباد:یورپ اکادمی جولائی۲۰۱۰ء)،ص۸۵۔

۲۰. ڈاکٹر حمیرا اشفاق،ترقی پسند تحریک کی مجلاتی صحافت:ایک جائزہ۱۹۳۶ء تا۲۰۱۱ء مشمولہ تحقیق نامہ،شمارہ ۱۸(جنوری تا جون۲۰۱۶ء)،ص۱۱۱۔

۲۱. محمد حمید شاہد،اردو افسانہ صورت و معنی (اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن جولائی۲۰۰۶ء)،ص۵۱۔

۲۲. ڈاکٹر صادق،ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ۱۹۳۶ سے ۱۹۵۶ تک(دہلی:اردو مجلس ۱۹۸۱ء)،ص۱۰۹۔

۲۳. زاہدہ بی،راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ(علی گڑھ:وانگ مایا بکس،۲۰۱۴ء)،ص۵۰۔

۲۴. تحسین بی بی،پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی شعور ۱۹۴۷ء تا ۲۰۱۱ء،غیر مطبوعہ مقالہ پی-ایچ-ڈی(اسلام آباد:نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز)،ص۶۴۔

۲۵. ڈاکٹر صادق،ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ۱۹۵۶ تک،ص۱۶۶۔

۲۶. ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء ۱۹۹۰ء(اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان دسمبر۱۹۹۱)،ص۵۴۔

۲۷. پروفیسر وہاب اشرفی،مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب،ص۱۵۹۔

۲۸. حمراء خلیق،کہاں کہاں سے گزر گئے(لاہور:سانجھ پبلشر۲۰۱۵ء)،ص۶۹۔

۲۹. ایضاً،ص۱۸۱۔

۳۰. ایضاً،ص۱۶۶۔

باب دوم

شعبہ جاتی عدم قبولیت (Alienation) کے تناظر میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ

مارکسی نظریہ بنیادی طور پر طبقاتی سماج کے غیر منصفانہ رویوں کو بے نقاب کرنے کی ایک بہترین کاوش ہے۔ ایسا سماج جہاں محض طبقاتی تفاوت افراد معاشرہ سے روٹی اور مکان کا حق چھین لے اس کی بنیادوں میں ناانصافی، غلط سماجی رویے اور ظلم و استحصال پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کارل مارکس کے نظریات میں () کا تصور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس تصور کا اردو ترجمہ کہیں بیگانگی ہے اور کہیں عدم قبولیت۔ مجوزہ تحقیق کے لیے عدم قبولیت کی اصطلاح کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس باب میں حمراء خلیق کے افسانوں کا عدم مقبولیت کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔

گھریلو زندگی کی عدم قبولیت

ہم جس سماج میں جی رہے ہیں اس کے معیارات کئی حوالوں سے طے شدہ ہیں۔ کہیں دولت کے نام پر، کہیں طاقت اور عہدے کے نام پر اور کہیں بڑے خاندان اور جاہ و حشمت کے نام پر۔ ان معیارات سے جو بھی گریز کرے گا یا ان پر پورا نہیں اترے گا اس کی قبولیت کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ معاشرے میں انسانوں کی تقسیم دو طرح کے طبقات کی صورت میں ہوئی ہے۔ ایک طبقہ بورژوا جو برسر اقتدار ہے اور دوسرا مزدور طبقہ جو زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہے اور جس کو بنیادی ضروریات زندگی بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ برسر اقتدار طبقہ مزدور طبقہ کو کسی صورت قبول نہیں کر پاتا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر شخص دوسرے سے بیگانہ ہے۔ انسان کی انسان سے، فرد کی سماج سے، سماج کی فرد سے اور سب سے بڑھ کر انسان کی خود اپنی ذات سے عدم قبولیت کا اظہار ہوتا نظر آتا ہے۔ نچلا یعنی مزدور، محنت کش طبقہ جتنی زیادہ محنت کرے گا جتنی زیادہ قدر پیدا کرے گا، اتنے زیادہ ہی اپنی قدر کھوتا جائے گا۔ برسر اقتدار

طبقہ طاقت ور ہوتا جاتا ہے اور اس کی زندگی عذاب بناتا جاتا ہے، اس کی آنکھوں سے نفرت جھلکتی ہے۔ اس کے اندر مزدور طبقے کے لیے عدم قبولیت پائی جاتی ہے۔ حمراء خلیق کے افسانوں میں بھی اس سماجی المیے کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ "دعا" میں افسانے کا مرکزی کردار "صابر" جس کا باپ ایک مزدور تھا ایک دن اچانک بیوی اور سات بچوں کو اس ظالم دنیا میں چھوڑ کر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ اگر افسانے کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ہمیں معاشرتی عدم قبولیت نظر آتی ہے۔ یعنی صابر کا باپ بحیثیت مزدور پورا دن کام کرتا تھا تاکہ اپنے بیوی، بچوں کا پیٹ پال سکے لیکن اس کی محنت رائیگاں چلی جاتی تھی کیوں کہ وہ اپنے سات بچوں کا پیٹ پال نہیں پاتا تھا۔ وہ کبھی اپنے گھر والوں کو ہی مطمئن نہیں کر پاتا جو پورا دن اس کی آس میں گزراتے تھے باپ کچھ کما کر لائے گا تو ان کا پیٹ بھرے گا۔ اس کا باپ صرف ایک معمولی مزدور ہی تو تھا جو دن بھر مزدوری کرتا تھا اتنی محنت مشقت کے بعد بھی وہ کچھ نہ کر پاتا تھا۔

افسانے کا مرکزی کردار صابر ہے، افسانہ نگار نے معاشرے میں صابر کے باپ کی عدم قبولیت کو موضوع بنایا ہے اور معاشرے کی بے حسی کی انتہا کو دکھایا ہے۔ افسانے میں بچوں کی اپنے والد کے انتظار کے حوالے سے واحد دلچسپی ان کے لیے خوراک کا بندوبست کرنا ہے:

> اس کا باپ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی پوری زندگی اینٹیں ڈھوتے گزر گئی تھی۔ دن بھر اس کے بچے اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھے اپنے باپ کا انتظار کرتے رہتے۔[1]

اس معاشرے کی بنائی گئیں قدریں اور بے حسی اس کا باپ مزدور ہونے کی وجہ سے جھیل رہا تھا، لیکن اس سب کے باوجود بھی وہ ان کی بنیادی ضروریات زندگی بھی پوری نہیں کر پا رہا تھا۔ حالانکہ وہ محنت و مشقت تو پورا دن کرتا تھا۔ پورا دن محنت کے باوجود اگر وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں لا سکتا تو پھر اس کی معاشرے کے اندر کوئی قبولیت نہیں۔ وہ یہ سب صرف اس لیے پورا نہیں کر پا رہا کہ وہ صرف ایک مزدور کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کو اس معاشرے میں اپنی مرضی سے جینے کا حق، اپنی مرضی سے خوشیوں کو منانے کا حق اس لیے نہیں تھا کہ وہ ایک مزدور تھا۔ معاشرے نے ذات پات کی تقسیم کر کے انسانوں سے اُن کے جینے کا حق چھین رکھا ہے۔ اس طرح افسانے کے اندر اس کے بیوی بچوں کا اُس کو امید کی نگاہ سے دیکھنا اس کا دن بھر انتظار کرنا۔ یہ سب متوازن طبقاتی تقسیم سے جنم لینے والے مسائل ہیں:

سات بچے جن کی بھوک پیاس اور لباس کا مداوا ان کے مزدور باپ کی اس مزدوری میں پوشیدہ تھا جو اگر بھوک مٹا دیتی تھی تو جسم نہیں ڈھانپ سکتی۔ اور اگر جسم ڈھانپ دیتی تھی تو پیٹ خالی رہتا تھا۔ لیکن ہر روز جب ان بچوں کا باپ گھر آتا تھا تو اس کے سارے بچے اور بیوی اس کو اس امید سے دیکھتے تھے جیسے وہ آج ضرور ان کی ساری ضروریات اور خواہشات پوری کر دے گا۔ ۲

افسانے میں اس کی بحیثیت سربراہ بھی عدم قبولیت ہے۔ یعنی وہ اپنی محنت مشقت کے باوجود وہ بنیادی ضروریات زندگی ہی پوری نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ جب اپنے بیوی بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں دے پا رہا۔ وہ بھی صرف اس وجہ سے کے وہ ایک مزدور پیدا ہوا تھا، اس کے بیوی بچوں کی خوہشات ہی کون سی بہت بڑی تھیں، کون سا ان نے زندگی کی آسائشیں آرام دہ بستر مانگا تھا۔ ان کی خوہشات نہیں بلکہ زندگی کی معمولی سی ضروریات تھی۔ جن کے بغیر زندگی نہ ممکن تھی لیکن ان انسانوں بھرے معاشرے میں وہ بھی پوری نہیں ہو پا رہی تھی:

انھوں نے تو انسانوں سے یہ سب کچھ نہیں مانگا تھا، لیکن یہ معاشرہ تو انھیں دو وقت کی سوکھی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے پھٹے پرانے کپڑے بھی نہ دے سکا۔ ۳

معاشرے میں موجود قدروں کو وضع کرنے والے، انسانوں کے لیے اتنے وسائل ہی پیدا نہیں کرتے جن سے وہ اپنے بیوی بچوں کو پال سکیں۔ ان کی وجہ سے معاشرے میں غربت، فلاس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غربت کی ایک بڑی وجہ ہمارے معاشرے میں دولت کا فقط چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ جانا ہے۔ جس کے باعث محنت کش طبقہ ذلت اور رسوائی کی زندگی گزرنے پر مجبور ہو جاتا۔ ان کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں ہوتے جس سے وہ اپنے بچوں کو پال سکیں۔ صابر کا کردار ایک چھوٹے ننھے بچے کا ہے۔ جس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا کہ جب ان کے ماں باپ ان کو دو وقت کی روٹی دینے سے ہی قاصر ہیں تو کیا ضرورت تھی ان کو شادی کرنے کی اتنے بچے پیدا کرنے کی۔ بچوں کی نظر میں ماں باپ کی عدم قبولیت افسانے میں نظر آتی ہے۔ جب وہ دونوں بچوں کو دو وقت کی روٹی نہیں دے پاتے تھے۔ تو ان کو بہت زیادہ مارتے تھے گالم گلوچ کرتے اپنی محرومیوں کا بدلا بچوں سے لیتے تھے، آپس میں لڑتے تھے:

ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ مارتے تھے۔ گالم گلوچ کرتے تھے۔۔۔۔ بھوک۔۔۔۔ تھکن اور ساری نفرتوں اور مایوسیوں کا غصہ بچوں پر نکالتے تھے اور پھر ایک سال بعد ایک نئی زندگی کو جنم دے دیتے تھے۔ اس جہنم میں ایک بھوکے ننگے انسان کا اضافہ کر دیتے تھے۔ ۴

ایسی بات نہیں تھی کہ اُس کا باپ محنت نہیں کرتا تھا، وہ دن بھر محنت کرتا تھا۔ اس کے باپ کا قصور بس اتنا تھا وہ کسی بڑے عہدے کا حامل نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی جائیداد نہیں تھی جس وجہ سے معاشرے کے اندر اس کا کوئی مقام ہوتا اور نہ ہی اس کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت تھی کیوں کہ وہ اپنے بچوں کی ضروریات ہی پوری نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر ایک دن اس کا باپ اس دنیا کی مصیبتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کی ابدی نیند سو گیا۔ اس کی ماں اس کے باپ کے مرنے پر چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ حالانکہ جب وہ زندہ تھا تو دونوں ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑتے تھے۔ شدید نفرت ہونے کے باوجود وہ اپنے شوہر کی موت پر تڑپ رہی تھی۔ بچے باپ کی میت کو دیکھ کر خوف میں مبتلا تھے:

> سارے بچے حیرت اور خوف سے سب کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ صابر جو سب سے بڑا تھا کھمبے کی آڑ میں چھپا سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ ماں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئی تھی اور بچوں اور اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔ ۵

جب شوہر زندہ تھا تو صابر کی ماں اس کی شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ مگر جب وہ مر گیا تو اس کے مرنے کی وجہ بچوں کو قرار دیا اور ان پر چلانا شروع ہو گئی۔ افسانے میں بچوں کی عدم قبولیت دکھائی ہے۔ ان کا باپ واحد کفیل تھا، ان کا واحد سہارا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اُسے دنیا میں کوئی آس امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسے میں وہ بچوں کو قبول کرنے سے قاصر تھی۔ وہ جانتی تھیں اب ان کی مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا ہے:

> میں تو نصیبوں جلی۔۔۔۔ یہ کم بخت۔۔۔۔ منحوس آرام خور باپ کو کھا گئے۔۔۔۔ مر گیا وہ بد نصیب ان کے ایندھن بھرتے بھرتے۔۔۔۔ اب کہاں سے کھاؤ گے۔۔۔۔ کیا کرو گے۔۔۔۔ خون تھکوا دیا کتوں نے اسے۔۔۔۔ اب چین آ گیا۔ ۶

ماں کے رونے چیخنے چلانے، الزام تراشیوں کی وجہ سے بچوں کے اندر خوف پیدا ہو گیا، وہ ڈر سہم کر ایک کونے میں چھپ گئے۔ ان کے گھر کا ہول ناک منظر تھا۔ صابر ماں کی حالت دیکھ کر بھی رو رہا تھا۔ اچانک سے کہیں سے چاولوں کی خوشبو آئی جس کو سونگھ کر وہ رونا بھول گئے کیوں کہ وہ کہی دنوں سے بھوکے تھے اور بھوک تہذیب کے سب آداب بھلا دیتی ہے۔ حمراء خلیق کے افسانوں کے بارے میں اظہار حیدر ان الفاظ میں رائے کا اظہار کرتے ہیں:

افسانوں کے اس مجموعے کو پڑھ کر ذہن اردو ادب کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ ان افسانوں کا تعلق اردو کے بابا افسانہ نویس منشی پریم چند کے افسانے "کفن"
کے بعد اب تک جتنے بھی چونکا دینے والے افسانے لکھے گئے، سے ہے۔ے

بھوک اتنی ظالم چیز ہے اس کے آگے بڑے بڑے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ بھوک کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ نظریہ نہ عقیدہ، اس کا مقصد صرف اور صرف دو وقت کی روٹی ہوتا ہے۔ بھوک کا مطلب تو صرف وہی جانتا ہے جس نے کبھی گندے نالوں سے پانی بھرا ہو تو کبھی کوئی سوکھی روٹی گیلی کی ہو۔ یہ بھوک ہی انسان کو ذلیل کرواتی ہے کبھی کوئی معصوم کہیں روٹی چرا کر بھاگتا ہے تو کہیں کوئی دہاڑی کے لیے ذلیل ہوتا ہے۔ اور کہیں کوئی کسی کے آگے ہاتھ پھلاتا ہے۔ منٹو نے اپنے امضمون میں لکھا تھا۔ "دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں، بھوک اُن کی ماں ہے۔۔ یہ بھوک گداگری سکھاتی ہے، جرائم کی ترغیب دیتی ہے، عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے۔۸ افسانے میں جب بچوں کو چاولوں کی خوشبو آئی تو وہ اپنے غم کو بھول گئے کیوں کہ وہ کئی دنوں سے بھوکے تھے وہ رونا بھول گے۔ انھیں اس وقت جو چیز دکھائی دے رہی تھی وہ بھوک تھی جو سب غموں سے بڑھ کر تھی سب بچے چاولوں کی پلیٹ پر ٹوٹ پڑے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ وہ دوسرے سے زیادہ اور جلدی کھائے۔ ان کے لیے ایک الگ احساس تھا جو آج سے پہلے کبھی انھیں ایسا کھانا کھانے کو نہیں ملا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے، آج سے پہلے یہ پڑوسن کہاں تھی جس نے انھیں ایسا کھانا نہیں دیا تھا، اور یہ کھانا تو صرف ان کے باپ کے مرنے پر ملا تھا اور پھر صابر نے ان سب چیزوں کو دیکھ کر اللہ سے دعا کی:

اللہ میاں کل کو میری ماں مر جائے۔ پرسوں کو میری بہن مر جائے اور پھر میرا بھائی۔۔۔ اور
سب یوں ہی مرتے جائیں۔۹

بھوک میں انسان کسی کو اپنا نہیں سمجھتا وہ سب سے بیگانہ ہو جاتا ہے ہر رشتے اور ذمہ داری سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ افسانہ میں بے حسی کی انتہا کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح رشتوں میں بندھی ہوئی اپنوں کی عدم قبولیت سے وہ شوہر کے زندہ ہوتے ہوئے بھی اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی، پھر اس کے مرنے کے بعد بچوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

افسانہ "Take care of yourself" اُن والدین کی کہانی ہے جو اپنے بچوں کی تعلم و تربیت کے لیے اپنا سب کچھ وار دیتے ہیں اور جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ ان کی زندگی کے مقاصد بدل جاتے

ہیں۔ پھر ان کے لیے ان کے ماں باپ کی سوچ ان کا طرز زندگی ان سب کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اس طرح کی کہانی افسانے میں بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ "فلک نما" نام کے فلیٹ میں وہ دونوں میاں بیوی رہتے تھے جن کے دو بچے تھے۔ والدین نے ان کی تعلم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجا۔ بیٹی کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوائی پھر وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ باہر مقیم ہو گے۔ ان کے بچے اپنی مصروف زندگی میں اتنے مگن ہو گئے کہ ان کے پاس اپنے ماں باپ کے لیے وقت نکالنا مشکل تھا:

> شروع شروع میں تو بیٹا بڑی پابندی سے خط بھیجا کرتا تھا۔ اس کی ماں کو ڈاکیے کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ "پوسٹ مین" کی دستک اور آواز کے ساتھ اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ جاتا تھا۔۔۔ میں اسے خط پڑھ کر سناتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر ہزاروں دعائیں دیتی تھی۔ کبھی روتی اور کبھی ہنستی۔۔۔ ہر خط میں یہ تسلی ضرور ہوتی تھی کہ ابھی مصروفیت بہت ہے جوں ہی فرصت ملے گی آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔ جب تک دوسرا خط نہ آجاتا تھا مجھ سے پرانا خط پڑھوکر سنتی رہتی تھی۔ ۱۰

افسانے میں بچوں کی زندگی میں ماں باپ کی کوئی جگہ نہیں رہتی وہ اپنی زندگی میں مصروف ہو چکے تھے۔ ان کا بیٹا پیسے کی دوڑ میں لگ چکا تھا۔ اب اس کی زندگی میں ماں باپ کے لیے وقت اور ان کی قبولیت ناممکن سی تھی۔ اب ان کے بچوں کی زندگی کی دوڑ اتنی تیز ہو چکی تھی کہ ماں باپ کا خیال تو دور کی بات ان کے پاس بات کرنے تک کا وقت نہیں تھا۔ حالانکہ دیکھا جائے تو بچہ جب سے پیدا ہوتا ہے اس کی پرورش کی خاطر ماں باپ محنت، مشقت برداشت کرتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی، صحت مند ہوں یا بیمار وہ اپنی اولاد کی خاطر اس کے اچھے مستقبل کی خاطر، ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ افسانے میں بیٹے کی مصروفیات زندگی اتنی بڑھ چکی ہیں کہ اس کے پاس خط لکھنے تک کا وقت نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اسے خط لکھنا بوجھ سا لگنے لگا تھا۔ اُسے ایسے لگتا تھا اُس سب سے اُس کا وقت ضائع ہو رہا ہے پھر وہ ماں باپ کو فون لگوانے کا کہتا ہے کیوں کہ اُس کی زندگی میں والدین کی عدم قبولیت ظاہر ہو چکی تھی:

> اب بیٹا اور بیٹی فون پر بات کر لیتے ہیں۔ ہمارے لیے تو یہ اطمینان کی بات تھی ہم ان کی آواز سن لیتے تھے اور ان کی ماں تو شاید دونوں بچوں خاص طور پر بیٹے کی آواز کو اپنے دل کے کیسٹ میں محفوظ کر لیتی تھی اور اس کے سرور میں مست رہتی تھی۔ ۱۱

ماں کی محبت جو کبھی بھی کسی صورت عمر کے کسی حصے میں بھی میں اپنے بچوں کے لیے کم نہیں ہوتی، چاہے بچے جیسے بھی ہوں ماں باپ ہی ہیں جو اپنی اولاد کی خاطر نہ صرف ہر طرح کی تکلیف دکھ اور مشقت کو برداشت کرتے ہیں۔ بلکہ آرام وراحت اپنی خوشی وخواہش کو بھی اولاد کی خاطر قربان کر دیتے ہیں۔ جب بچہ بیمار ہوتا ہے تو ماں باپ بے چین ہو جاتے ہیں، ان کی نیندیں حرام ہو جاتیں ہیں اس کے علاج کے لیے ڈاکٹروں کے چکر لگاتے ہیں۔ لیکن بچے بڑے ہو کر پیسے کی دوڑ میں اپنے ماں باپ تک کو بھول جاتے ہیں۔ افسانے میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ بھی انھیں کے بچے مادیت کے پیچھے اپنے ماں باپ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے:

> زمین کے فاصلوں نے دلوں کے فاصلے بھی بڑھا دیے۔ گفتگو مختصر سے مختصر ہوتی چلی گئی۔ اب چار چھ ماہ بعد ایک فون آتا تھا۔ بیٹا بہت جلدی میں ہوتا تھا۔۔۔ اور صرف یہی کہتا، "ابا، اماں" "Take care of yourself" ۱۲

بچوں کے ایسے رویے سے ماں پلنگ سے لگتی چلی گئی۔ پھر اس کی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ وہ کسی کے ساتھ بات تک نہ کرتی تھی نہ روتی تھی نہ ہنستی تھی جیسے زندگی سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی ہو۔ اتنا درد تکلیف لوگوں سے نہیں ملتا جتنا اپنوں کے رویوں سے ملتا ہے، اور وہ بھی اس جگہ یا اس شخص سے جس سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ ہوں۔ اولاد کی طرف سے ملنے والا غم تو ماں باپ کبھی برداشت ہی نہیں کر پاتے کیوں کہ ماں باپ کی محبت ہی ایسی واحد محبت ہوتی ہے جسے کوئی غرض نہیں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ مجنوں گورکھپوری نے محبت کے بارے میں کہا تھا: "محبت ایک لطیف اور پاکیزہ جذبہ ہے جس کو دنیا کی کثافتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ "۱۳ بچوں کی بے رخی کی وجہ سے ان کے ماں باپ نے پھر وہ فلیٹ ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب بھی اس کے باپ کو اپنے بچوں کی یاد آتی تو اپنی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اکثر فلیٹ میں چکر لگاتا:

> اچانک پورا فلیٹ آوازوں سے بھر جاتا ہے۔ لگتا ہے چھتیں، دیواریں، دروازے، کھڑکیاں، پلنگ، کرسیاں، برتن سب مل کر چیخ رہے ہیں۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے، " Take care , Take care"، میرے کان پھٹنے لگتے ہیں۔ مجھے چکر آنے لگتے ہیں اور لگتا ہے، میری ایک ایک نس چیخ جائے گی۔ مجھے قے ہو جائے گی۔ میرے اندر سے سب کچھ باہر آجائے گا۔ میں

کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتاہوں۔ لیکن آوازیں اونچی ہوتی جاتی ہیں۔" , Take care

Take care"[۱۴]

بوڑھے ماں باپ کی جگہ ان کے بچوں کی زندگی میں ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ماں باپ بچوں سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ بچوں کی مصروف زندگیوں میں ان کی قبولیت نہیں رہتی وہ اپنے ماں باپ کو تنہا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بڑھاپے میں والدین کو سب سے زیادہ بچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انھوں نے والدین کو تنہا چھوڑ دیا۔

افسانہ "میں پھول چننے آئی تھی" میں غربت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مرکزی کردار ایک چھوٹی بچی کا ہے۔ وہ اور اس کے ماں باپ کے علاوہ ان کے گھر میں ایک طلاق یافتہ پھوپھی بھی رہتی تھی۔ اس کا باپ مزدور تھا اور لیکن وہ غربت کے باعث بیمار ہو کر گھر کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ بچی اور اس کی ماں روز کاغذ چنتے تھے۔ ان کے گھر کی واحد کفیل اس کی ماں تھی۔ وہ پورا دن محنت سے کاغذ چنتی تھی اس کے بعد گھر آکر گھر کا سارا کام بھی کرتی تھی۔ اپنے شوہر، نند کی خدمت کرتی ان کی دیکھ بھال کرتی لیکن اس کے باوجود اس کی اس کے گھر میں عدم قبولیت تھی، اس کی نند نے اس کا جینا حرام کیا ہوا تھا:

> اس کی خطا یہ تھی کہ اس کی اولاد نہیں ہوتی تھی لیکن شاید میری ماں کی خطا یہ تھی کہ وہ ایک بیٹی کی ماں تھی اور میری پھوپھی اپنی محرومیوں کا بدلہ میری ماں سے لیتی تھی۔ میرے باپ اور پھوپھی میں گاڑھی چھنتی تھی لیکن میری ماں اور پھوپھی کی کبھی نہیں بنی۔ وہ سارا دن گھر میں پلنگ پر چڑھی بیٹھی یا تو میرے باپ سے دنیا جہاں کی باتیں کرتی رہتی یا پھر جب میری ماں دوپہر کو تھک ہار کر گھر پہنچتی تو اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیتی[۱۵]

اس کی پھوپھی پر معاشرے کا دباؤ اس کی اولاد نہ ہونے پر تھا۔ اس کی معاشرے میں قبولیت نہیں ہے۔ بغیر اولاد کے کوئی اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، جس کے باعث اس کی طلاق ہو گئی۔ ہمارا معاشرے بے اولاد عورت کو جینے نہیں دیتا، اس کو دن رات ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کو معاشرے میں محسوس الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔ بانجھ، منحوس وغیرہ کے القابات کی وجہ سے معاشرہ بے اولاد عورت کو قبول کرنے کے لیے کسی صورت تیار نہیں ہوتا۔ اس طرح اس کی پھوپھی کو معاشرے کی ان اقدار کے باعث طلاق ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنی ان محرومیوں کا بدلہ اپنی بھاوج سے لیتی ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کا بھائی جو بے کار گھر پڑا تھا اس کو کچھ کہتی مگر وہ اس

بھاوج کا جینا حرام کر چکی تھی۔ جو عورت ہونے کے باوجود گلیوں گلیوں خاکہ چھانتی تھی۔ دونوں بہن بھائی کا پیٹ پالتی تھی لیکن دونوں مل کر اس سے لڑتے تھے۔ اس کی ایک ہی بھتیجی تھی لیکن اس کی پھوپھی اس کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی:

> جتنی دیر گھر میں رہتی تھی گھر کے کام، میاں کی خدمت اور نند کی ناز برداری میں گزارتی تھی۔ میں نے اپنی ماں کو کبھی منھ سے بولتے دیکھا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یا تو وہ گونگی ہے یا اس کی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے۔۔۔ میری ماں صبح اذان کی آواز کے ساتھ اٹھتی تھی۔ چولھا جلا کر چائے بناتی میرے باپ اور پھوپھی کے لیے روٹیاں پکاتی۔ جب چائے اور روٹیاں پک جاتیں تو وہ مجھے اٹھاتی۔ شروع شروع میں تو میں نے اٹھنے پر بڑا فضیحتا مچایا لیکن پھر یہ بات میرے دماغ میں اچھی طرح بیٹھ گئی کہ اگر میں جلدی سو کر نہ اٹھی تو ماں مجھے گھر چھوڑ جائے گی اور پھر میں سارا دن ظالم پھوپھی کی گالیوں کا نشانہ بنی رہوں گی۔[۱۶]

افسانے میں ہر ایک کی دوسرے کی زندگی میں عدم قبولیت ہے جب تک وہ کام کرتے رہیں گے ان کا پیٹ پلتا رہے گا۔ اگر وہ کام کرنا چھوڑ دے گی تو ان کو کچھ بھی کھانے کے لیے نہیں ملے گا۔ غربت کے باعث غریب طبقے کی اور کون سی ضروریات زندگی ہوتی ہیں سوائے دو وقت کی روٹی کے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں کہا تھا:

> اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
>
> کاخ امراء کے در و دیوار کو ہلا دو
>
> جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روٹی
>
> اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو[۱۷]

غربت کی وجہ سے نچلے طبقے کے ہاں کھانے کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب تب سمجھ آتا ہے، جب ان آس بھری آنکھوں کی طرف دیکھا جائے جو سوال کرتی ہیں، اپنی بے بسی پر اور معاشرے کی بے حسی پر غریبوں کو کون سے محلوں کی تلاش ہوتی ہے وہ کون سے محلوں میں رہنے کے آدھی ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی تو جھونپڑیوں میں بسر کرتے ہوئے گزر جاتی ہیں۔ اس طرح ان کا گھر بھی انتہائی خستہ حال تھا:

ہمارا گھر کھادار میں تھا۔ اسے گھر کہنا بھی گھر کی توہین تھی۔ وہ ایک نہایت پرانی خستہ حال بلڈنگ کا چھوٹا سا تاریک کمرہ تھا۔ گراؤنڈ فلور پر ہونے کی وجہ سے دھوپ اور روشنی کا اس میں دور دور تک گزر نہیں تھا۔ اسی ایک کوٹھری میں سونا جاگنا، پکنا ریندھنا، اٹھنا بیٹھنا سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ ماں جب چولھا جلاتی تھی تو گیلی لکڑیوں سے نکلتا ہوا دھواں سارے گھر میں بھر جاتا تھا اور کوٹھری میں موجود سارے آدمیوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے اور وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو جاتے تھے۔ ۱۸

محنت کش طبقے کی زندگی میں دو وقت کی روٹی بڑی مشکل سے پوری ہوتی ہے، وہ ان خوہشات کا کیا کرے گا۔ لیکن بچے تو بچے ہوتے ہیں چاہے غریب کے ہوں یا امیر کے ان کی خوہشات تو ہوتی ہیں، اُسی طرح جس طرح امیروں کے بچوں کی ہوتی ہیں۔ انھیں بھی کھلونوں سے کھیلنے، سکول جانے، رنگ برنگی کتابوں کو پڑھنے کا دل کرتا ہے۔ مگر یہ معاشرہ جس کی بنائی گئی اقدار، جن میں صرف امیروں کو ہی ان خواہشات کو پورا کرنے کا حق ہے، غریب ان کی برابری کیسے کر سکتا ہے۔ غریب کا بچہ اس سکول یا کالج میں کیسے پڑھ سکتا ہے، جس میں اونچے طبقے کے بچے پڑھتے ہیں، نچلے طبقہ کی ان خواہشات کو معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ افسانے میں اس چھوٹی بچی کی بھی وہی حسرتیں ہیں کہ جب وہ اونچے طبقے کے بچوں کو دیکھتی ہے جب وہ بازار میں انھیں سکول، کالج جاتا دیکھتی ہے۔ تو اس کا دل بھی مچلنے لگتا ہے:

ماں کاغذ اٹھاتی رہتی اور میں مختلف دکانوں میں جھانکتی رہتی۔ گھنٹوں رنگ برنگی کتابوں کو دیکھتی۔ میں ایک جاہل اور غریب گھر کی لڑکی تھی۔ مجھے ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا لیکن ان دکانوں کے شوکیسوں میں رکھی ہوئی رنگین کتابیں، ان میں سے آتی ہوئی کاغذ کی ایک مخصوص خوشبو مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ میری اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن میرا جی یہ چاہتا تھا کہ میں ان کتابوں، کاپیوں کے اندر گھس جاؤں۔۔۔۔ ۱۹

وہ اپنی حسرت بھری نگاہوں سے ان دکانوں کو دیکھتی تھی، وہ بچی تھی اس کا دل چاہتا تھا لیکن اس ناداں کو کیا معلوم تھا وہ سب کچھ اس کے لیے نہیں ہے۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے اسکول، کالج کی بچیوں کو وہ سب چیزیں خریدتے ہوئے دیکھتی تھی۔ نچلے طبقے کے بچے حسرتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں، انہی کے ساتھ جوان ہوتے ہیں پھر انہی حسرتوں، امیدوں کو لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ انھیں کیا معلوم ان کو خواہشات رکھنے کی اجازت نہیں۔ ان کی خوہشات کو معاشرہ کبھی قبول نہیں کرتا:

میں سوچا کرتی، کیا میں ان لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں؟ کیا مجھے یہ سب کچھ نہیں مل سکتا؟ آخر یہ لڑکیاں ان کا کیا کرتی ہیں؟ کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے؟؟[۲۰]

نچلے طبقے کے حالات کبھی بدل نہیں سکتے، وہ خواب تو دیکھتے ہیں مگر ان کو خوابوں کی تعبیر نہیں ملتی۔ اس لیے ان کی سوچوں کی حدود ہی محدود ہوتی ہے۔ وہی دو وقت کی روٹی۔ وہ محنت تو کرتا ہے لیکن اس کی محنت کا پھل اُسے اس طرح نہیں مل پاتا جتنا اس کا حق ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی زندگی میں مایوسی جنم لینے لگتی ہے۔ نچلے طبقے کی محنت کا صلہ اتنا محدود ہوتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی ہی پوری نہیں کر پاتے، ان کے پاس اضافی بچت کیا ہوگی جو وہ اپنی خواہشات کو پورا کریں گے۔ افسانے میں اس کی ماں پورا دن محنت کرنے کے باوجود صرف دو وقت کی روٹی ہی پوری کر پاتی تھی اس سے ان کے حالات کیا بدل پاتے:

ہم دونوں کو ان گلیوں میں خاک چھانتے سالوں بیت گئے۔ میں جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگی اور ماں جھک جھک کر کاغذ چنتے چنتے بالکل جھک گئی۔ لیکن ہماری زندگیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔۔۔ اس تمام عرصے میں ہمیں کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا اور نہ ہمارے پھٹے پیوند لگے کپڑوں کی شکل بدلی۔ اب میں شعور کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔۔ میں نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ ماں خواہ یہ کاغذ چنتے چنتے قبر میں بھی اتر جائے لیکن ہمارے حالات جوں کے توں رہیں گے۔[۲۱]

نچلے طبقے کا بڑا المیہ تلاش معاش تو ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ اُن بیماریوں، پریشانیوں، مصیبتوں نے انھیں الگ گھیرا ہوتا ہے۔ گھر کا ایک فرد اگر کما رہا ہے، تو اس کے ساتھ اگر کوئی مسئلہ پیش آجائے تو پورا گھر مصیبتوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ افسانے میں معاش سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جو شخص کما رہا ہے اس کی قبولیت ہے، اگر وہ کمانا چھوڑ دے گا تو اس کی کسی صورت قبولیت نہیں ہے۔ اس کی ماں نے پوری زندگی پورا دن محنت مشقت کے ساتھ اپنے شوہر اور اس کی بہن کا پیٹ پالا لیکن جب وہ خود بیمار ہوتی ہے تو وہ ان دونوں کے لیے ناکارہ ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی قبولیت ختم ہو جاتی ہے، ان کی نظر میں:

ماں دن بدن کم زور ہوتی جا رہی تھی اور بیمار رہنے لگی تھی، جس کی وجہ سے اسے کئی کئی دن ناغے کرنا پڑتے تھے۔ وہ دن ہمارے لیے قیامت کے دن ہوتے۔ بھوک اور فاقے کے ساتھ باپ کی

ڈانٹیں، پھوپھی کی گالیاں، کوسنے اور اس پر ماں کی آہیں، مگر یہ سب کچھ جیسے ہمارا مقدر بن چکے تھے۔ ماں کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ اس کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس گھر میں سب سے زیادہ قابل رحم ماں کا وجود تھا لیکن اس پر کوئی رحم نہیں کھاتا تھا۔ ۲۲

نچلے طبقے کی بھی خواہشات ہوتی ہیں ان کے بھی اپنے بچوں کے لیے ارمان ہوتے ہیں ان کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر کسی مقام پر پہنچ جائیں لیکن یہاں پر بھی عدم قبولیت غالب ہے۔ اس کی ماں کی بھی امیدیں ہوتی ہیں لیکن جلد ہی اسے سمجھ آجاتی ہے کہ اس کی یہ امیدیں کبھی پوری نہیں ہو پائیں گی:

لیکن جب تک تو استانی بنے گی ہم سب بھوک سے مر چکے ہوں گے۔ کیا تو بھوکی رہ کر پڑھ لے گی ؟جا اٹھ وہ کونے سے بوری لے لے۔ ۲۳

بھوک بڑی ظلم چیز ہے وہ کچھ نہیں دیکھتی نہ لوگوں کے ارمان دیکھتی ہے نہ ان کی امیدیں اس نے لگنا ہے سو وہ لگ کر رہتی ہے۔ ایسی بات نہیں ہوتی نچلا طبقہ خواب نہیں دیکھتا وہ خواب تو دیکھتا ہے لیکن ان کو پورا کرنے کی سکت اس میں نہیں ہوتی۔ وہ جس طرح جس زندگی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اُسی کے ساتھ ہی مر جاتا ہے لیکن اس کی خواہشات اور اس کے خوابوں کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔

معاشرتی عدم قبولیت

حمراء خلیق کے افسانہ "حوا کی بیٹی" کا جائزہ لیا جائے تو اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بھکارن کا ہے جس کی موت کی موت واقعہ ہو جاتی ہے۔ واقعہ یوں ہوتا ہے کہ ایک عمارت گرتی ہے اس میں اور بھی بہت سے لوگ تھے جیسے مزدور وغیرہ ان کی کوئی نہ کوئی شناخت تھی کہیں نہ کہیں سے ان کا تعلق تھا، کوئی نہ کوئی ان کو جانتا تھا مگر وہ بوڑھی عورت اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ افسانے میں عدم شناخت کا عنصر غالب ہے۔ عمارت کے ملبے تلے سے لوگوں کو ایک لاش ملی تھی جس کو دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گیئں گی:

ایک کمزور ناتواں جسم ملبے سے باہر نکلا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔۔۔ سفید بال جو الجھ کر جٹائیں بن چکے تھے۔۔۔ آنکھیں دھنسی ہوئی۔۔۔ پلکیں جھڑی ہوئیں۔۔۔ پیلا چہرہ۔۔۔ سوکھا جسم ۔۔۔ چہرے پر کرب اور تکلیف۔ وہ کون تھی؟ ۲۴

ہر شخص جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی شناخت ہوتی ہے، معاشرے میں اس کا کوئی نہ کوئی مقام ہوتا ہے۔ یا وہ سماج میں اپنے کسی اچھے یا برے کیریئر سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن سے اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ اُس کو بھی معاشرے نے ایک بھکارن کا نام دیا ہوتھا جس نے سالوں اس عمارت کے سامنے بیٹھے ہوئے گزار دیے تھے۔ نہ کبھی کسی نے اس کے منہ سے آواز سنی، نہ کوئی صدا، وہ خاموشی سے صرف ہاتھ آگے بڑھا دیتی تھی کوئی کچھ دے نہ دے، کم دے زیادہ دے اس کی آواز تک نہ آتی تھی۔ کچھ لوگ تو اس کو نفرت کی نظر سے بھی دیکھ کر چلے جاتے تھے:

> اس پر وہیں بیٹھے بیٹھے نہ معلوم کتنے موسم گزر چکے تھے۔ کتنے ہزار لوگوں نے اس پر رحم کھایا تھا۔۔۔ اسے بھیک دی تھی۔۔۔ اور ایسے بھی تھے جو محض اس پر ایک نفرت اور تحقیر کی نظر ڈال کر گزر جایا کرتے تھے۔۔۔ اور یہ لوگ تھے جو شاید جانتے تھے کہ وہ دراصل کون تھی؟ ۲۵

جو لوگ اس بھکارن کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اصل میں وہی لوگ ہی اسے جانتے تھے، وہ ماضی اور حال کے درمیان سب کچھ جانتے تھے جب وہ جوان خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ اس شاہراہ کے پاس آکر کھڑی ہوتی تھی۔ وہ ایک خاص خلیے میں بن سنور کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی غرض سے اس شاہراہ پر آکر کھڑی ہوتی تھی۔ جس سے اُسے دیکھنے والے اس کی طرف مائل ہوں "حوا کی بیٹی" افسانہ، ان عورتوں کے متعلق ہے جو سماج کے اندر غربت افلاس سے تنگ آکر طوائف کا روپ دھار لیتی ہیں:

> بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ لمبی لمبی پلکیں۔۔۔ پتلے پتلے ہونٹ جن پر گہری لال لپ اسٹک۔۔۔ نازک چھریرا بدن۔ ہر آنے جانے والے کو ایک خاص نظر سے دیکھتی۔۔۔ کبھی ٹھٹک جاتی۔۔۔ کبھی مسکراتی۔۔۔ کبھی سہم جاتی اور کبھی نہایت بے باک انداز میں قریب آنے والے کو دیکھتی اور پھر کوئی آتا جو اس کا ہاتھ پکڑ کر نہ جانے کہاں لے جاتا۔ ۲۶

مرد معاشرے میں سب سے چھپ کر عورت کے ساتھ تعلقات تو بنا لیتا ہے مگر جب اس کو معاشرے میں عزت و مقام دینے کی بات آتی ہے تب وہ معاشرے میں اپنی جھوٹی عزت کی خاطر خاموش ہو جاتا ہے۔ عورت مرد کے لیے چاہے جتنا بھی خوشی کا سامان پیدا کر لے وہ کبھی بھی اس کو وہ مقام و مرتبہ نہیں دیتا جس کی وہ حق دار ہے۔ وہ مرد کی عزت کی خاطر اپنی خوشیوں تک کو قربان کر دیتی ہے۔ نیاز فتحپوی عورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

عورت ایک روحانیت ہے قابلِ لمس، نورانیت ہے صاحب نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں۔ ایک نکہت ہے جس سے ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔ ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے سنی جاتی ہے۔۲۷

مگر مرد اسے وہ مقام نہیں دیتا۔ اسے دنیا کے سامنے نہیں پیش کرے گا اور اپنی ان کامیابیوں کا ذکر بھی نہیں کرتا جو اس نے عورت کی وجہ سے حاصل کی ہوں گی۔ مرد عورت کو صرف کھلونا سمجھ کر استعمال کرتا ہے، اس کے ساتھ رات اندھیرے میں قیام تو کرے گا مگر دن میں اُسی عورت پر پتھر مارنے والوں کے ساتھ کھڑا ہو گا۔ افسانے میں بھی بھکارن کو ان سب چیزوں کا سامنا تھا۔ وہ ہر رات بن سنور کر کراچی کے باسیوں کے لیے کھڑی ہوتی تھی اور کوئی آتا، اس لے کر چلا جاتا پھر اپنی ہوس کو پورا کر کے اُس پھینک دیتا اور پھر اگلی رات وہ وہیں کھڑی ملتی، ایسے جیسے ہمیشہ سے وہ وہیں کھڑی ہو:

کتنے سال بیت گئے۔۔۔ جاڑے، گرمیاں، بہار اور خزاں۔۔۔ کتنی راتیں گزر گئیں زمانے کے سرد و گرم نے اس کو لڑکی سے عورت میں تبدیل کر دیا۔۔۔ ہر رات کے ہر نئے تجربے نے اس عورت سے اس کی جوانی چھین لی۔۔۔ شادابی لوٹ لی۔۔۔ چہرے کی شفق رنگ سرخی پر سیاہی غالب آنے لگی۔۔۔ رسیلے ہونٹوں پر دلبرانہ مسکراہٹ کی جگہ زہر خند نے لے لی۔ کسے ہوئے جوان جسم کو وقت کے جابر ہاتھوں نے مسل کر رکھ دیا۔۔۔ نہ وہ گداز باہنیں رہیں نہ وہ سڈول جسم۔۔۔ وہ جو خوشہ چین پنچھیوں کے لیے کبھی سرسبز اور تناور درخت تھی اب خزاں رسیدہ زرد شجر بن چکی تھی جس کے سارے طائر ایک ایک کر کے اڑ چکے تھے۔۲۸

عورت کو اللہ نے فطرتاً حساس اعصاب کا مالک بنایا ہے۔ افسانے میں اس کی غربت کے باعث یہ معاشرہ اس کی جوانی اُس سے کیش کروانے کے بعد بھی اس کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس معاشرے نے اس کو اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے بطور کھلونا استعمال کیا۔ اس کے بعد وہی معاشرہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ہمارے ہاں وہ معاشرے ہے، جس کے بارے میں منٹو نے کہا تھا کہ "اس برہنہ معاشرے کو برہنہ گوئی، ہی سے زچ کیا جا سکتا ہے۔۲۹ افسانے کے اندر زندگی کی بے معنویت نظر آتی ہے۔ وہ زندگی سے تھک ہار چکی تھی۔ معاشرے نے چیل کوؤں کی طرح اس

کے جسم کو نوچ کر کھالیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں سب کچھ ہار دیا تھا وہ سب کچھ گنوا چکی تھی۔ وہ تھک ہار کر اب اس مقام پر آ کر بیٹھ چکی تھی:

> زندگی کے اسٹیشن پر وہ ایک ایسا تنہا مسافر تھی جس کے سامنے سے گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ اسے آگے جانا تھا لیکن زادِ راہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ تھک کر اسی جگہ بیٹھ گئی پھر وقت نے اسے بھکارن کا نام دے دیا۔ ۳۰

افسانے میں عدم شناخت اور زندگی کی بے معنویت غالب نظر آتی ہے۔ اس بھکارن نے زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کیا مشکل دور گزار، اس کے باوجود وہ کچھ نہیں تھی حالانکہ وہ ایک عورت تھی۔ ایک عام انسان تھی لیکن اس کے باوجود اس کی کوئی پہچان کوئی شناخت نہ تھی۔ جب تک وہ جوان تھی اس کو کش کیا جاتا رہا لیکن اب وہ بوڑھی ہو چکی تھی اس کا وقت ختم ہو چکا تھا تو معاشرے نے بھکارن کا نام دے دیا۔ اس کے پاس معاشرے نے کوئی اور انتخاب ہی نہ چھوڑا تھا۔ آج اس کے مرنے کے بعد وہ تن تنہا تھی۔ اس کا بوڑھا سوکھا جسم جو ملبے تلے سے نکلا تھا اس کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی:

> کوئی اس کا وارث نہیں تھا۔۔۔ اس کو کندھا دینے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔ اس کی نماز جنازہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔ کوئی اس کا بیٹا نہیں تھا، وہ کسی کی ماں نہیں تھی۔۔۔ کوئی اس کا شوہر نہیں تھا، وہ کسی کی بیوی نہیں تھی۔۔۔ کوئی اس کا باپ نہیں تھا، کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔۔۔ وہ کسی کی بیٹی اور بہن نہیں تھی۔ ۳۱

معاشرے میں کوئی بھی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ کوئی اس کے مرنے پر غم زدہ نہ تھا وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جس کو قبر میں اتار دیا گیا۔

افسانہ "یتیم" معاشرے کے ان افراد کی عکاسی کرتا ہے، جن کو کسی حال میں لوگ جینے نہیں دیتے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک جوڑے کا ہے۔ جو جدی پشتی مال دار کئی ملوں اور کارخانوں کے مالک ہیں۔ مگر ان کی کوئی اولاد نہیں۔ بظاہر تو وہ بڑی ہنسی خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں لوگوں کے سامنے لیکن کوئی ان کے غم کو نہیں سمجھ سکتا۔ ویسے بھی ہمارا معاشرہ بے اولاد لوگوں کا جینا حرام کر دیتا ہے۔ ایسے جوڑوں کو ڈر سہم کر زندگی گزارنی ہوتی ہے وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں۔ اس خطرہ سے ہی دوچار رہتے ہیں کہ کوئی ان سے اولاد کے متعلق سوال نہ کرے کوئی ان

کی اولاد نہ ہونے کی وجہ نہ پوچھ لے۔ ان کی زندگیوں پر کڑی پابندیاں سی لگ جاتی ہیں۔ وہ عام انسانوں کی طرح معمول کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ معاشرہ ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ ایک سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔ اس طرح افسانے میں رضوان صاحب اور ان کی بیوی بھی ان سب چیزوں سے گزر رہے ہیں۔

> دنیاوالوں کی نظروں میں وہ دونوں نہایت پر سکون، مطمئن اور عیش وآرام کی زندگی گزار رہے تھے، بلکہ کہنا چاہیے قابل رشک زندگی۔ اپنے پرائے کچھ انھیں اس طرح دیکھ کر خوش ہوتے تھے تو کچھ جلتے بھی تھے، اور بعض اس بات پر حیران تھے کہ اتنی بے شمار دولت ہے، لیکن اولاد نہیں ہے۔ ان کے بعد اس دولت، ملوں اور کارخانوں کو دیکھنے والا کون ہو گا۔ ۳۲

بے اولاد لوگوں کو کوئی آرام سے سکون کی زندگی جینے نہیں دیتا اگر وہ اپنی زندگی میں خوش ہوں تو ان کی خوشی لوگوں کو ہضم نہیں ہوتی کہ وہ خوش کیوں ہیں۔ اگر اداس ہوں تو ان سے ایسے برتاؤ کرتے ہیں جیسے ان سا مظلوم انسان اس دنیا میں کوئی نہ ہو ان کی زندگی جہنم بنادی جاتی ہے۔ لیکن ان کے غم کو کوئی کبھی سمجھ نہیں سکتا اس طرح افسانے میں سب لوگ ان کی زندگی کے متعلق باتیں کرتے ہیں سب یہ سوچ رہے تھے ان کو کسی چیز کی پروا نہیں ان کی اتنی جائداد کون کل کو سنبھالے گا کون اس کی دیکھ بھال کرے گا:

> اولاد کی چاہت کس کو نہیں ہوتی، اور پھر جس کے پاس دولت کے انبار لگے ہوں، رتبہ ہو، ہر طرح کی نعمت خداوندی حاصل ہو تو کیا وہ یہ خواہش نہیں رکھتے ہوں گے کہ اس دولت سے مالا مال گھر کے آنگن میں بچوں کی میٹھی آوازیں، پیاری پیاری فرمائشیں، معصوم ہنسی، کبھی کوئی ضد، ناز نخرے اور کلکاریاں مارتے ہوئے بچے نہ ہوں۔۔۔ دنیا کا کون سا ڈاکٹر یا طبیب نہیں تھا جس سے دونوں نے اس سلسلے میں بات نہ کی ہو۔ مشورہ نہ لیا ہو، یا ان کے بنائے ہوئے علاج نہ کرائے ہوں۔ دوا نہ کھائی ہو، ٹیسٹ نہ کرائے ہوں، لیکن ان کی خواہش کو پورا کرنا کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ ۳۳

معاشرے میں مختلف قسم کے معیارات ہیں اور معاشرہ ان معیارات کے مطابق ہی ہر ایک کو زندگی گزارنے کی اجازت دیتا ہے۔ ہم کسی کو اچھے حال میں بھی دیکھ کر خوش نہیں ہوتے اور اگر کوئی برے حال میں ہے تو اس کا جینا ہی حرام کر دیتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود اولاد جیسی نعمت کی کمی ہے تو کیسے ہو سکتا ہے ہم

اس کی ایک کمی کو بھول جائیں اور باقی چیزوں کو ترجیح دیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ان سب چیزوں سے تنگ آ کر جب ان لوگوں نے بچہ گود لینے کا سوچا تو پورے خاندان کے لوگ ان کی مالی حیثیت کی وجہ سے اپنا بچہ دینے کے لیے تیار ہو گئے کسی کو ان سے ہمدردی نہیں تھی، ہر ایک اپنے بچے کا مستقبل سوچ رہا تھا۔ لیکن ان نے ایدھی ہوم سے یتیم بچہ گود لینے کا فیصلہ کیا، تو کوئی بھی ان کے فیصلے سے خوش نہیں تھا۔ ہمارا معاشرہ کسی لاوارث بچہ کو گود لینے کے حق میں کبھی نہیں ہوتا۔ ایسے بچے پر ہزاروں سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ وہ کہاں سے آیا کس کا ہے۔ حلال حرام ہر طرح کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ معاشرہ انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اس طرح رضوان صاحب اور ان کی بیگم کے ارادوں کے بارے میں جان کر ان کے رشتہ داروں کے رویے تبدیل ہو گئے:

> جب رشتے داروں کو ان کے اس ارادے کے بارے میں پتا چلا تو وہ بہت خفا ہوئے اور مایوس بھی ۔کچھ لوگوں نے تو ان سے تقریباً قطع تعلق بھی کر لیا۔ بعض نے جیسا کہ عام طریقہ ہے، ان پر مغرور، بد دماغ اور اپنی دولت پر غرور کرنے والے کی تہمت بھی لگائی۔ وہی رشتے دار جو ہر وقت ان کے گھر آتے تھے، تقریبات اور دعوتوں میں شریک ہوتے تھے، ان کو اپنا رشتے دار بتانے میں فخر محسوس کرتے تھے، ہر محل میں ان کے اخلاق اور حسن سلوک کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے، اب انھی میں دس عیب نکالنا شروع ہو گئے تھے۔ اس سب کا رضوان صاحب اور سائرہ بیگم کو بہ خوبی اندازہ تھا اور لوگوں سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔ اس لیے وہ لوگ زیادہ پریشان نہیں ہوئے۔ ۳۴

اس بچے کے ان کی زندگی میں آجانے کی وجہ سے ان لوگوں کی زندگی ہی بدل گئی ان کی ویران زندگی میں جیسے بہار ہی آگئی ہو۔ انھیں دنیا کی دولت سے وہ خوشی نہ نصیب ہوئی تھی جو ان کے گھر میں اس بچے کی وجہ سے آئی تھی۔ بچے کے لیے ان دونوں نے دنیا کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جو نہ خریدی ہو قیمتی سے قیمتی چیز خریدی گئی اس کو اس دنیا میں ایک نام اور پہچان دی گی آب وہ یتیم یا بے سہارا بچہ نہ تھا آب اس کا ایک گھر اور ایک خاندان سے تعلق تھا:

> اس بچے نے ایک سونی گود بھر دی تھی۔ دو دنوں کی وہ آرزو پوری کی بھی جیسے دنیا کی کوئی دولت پوری نہیں کر سکی تھی۔ ہر طرح کا عیش و آرام حاصل ہونے کے باوجود دل کا کھوکھلا پن جو انھیں اندر ہی اندر سنگسار کرتا رہتا تھا، اس ننھے وجود نے اس کو بھر دیا تھا۔ ننھی سی اس جان نے اُس

اندھیرے کو مٹا دیا تھا جو لاکھوں بلبوں اور ہزاروں چراغوں کے باوجود دلوں کی تاریکی کو دور نہیں کر سکا تھا، تو ظاہر ہے وہ بچہ آنکھوں کا نور ہی تھا جس کا نام نور العین ہی ہو سکتا تھا۔ ۳۵

ان لوگوں نے اس بچہ کے لیے کیا کچھ نہ کیا تھا اس کی ہر خواہش کو پورا کیا اس کے منہ سے کوئی بات نکلنے کے ساتھ ہی پوری ہو جاتی۔ اس کو بڑے سے بڑے سکول کالج میں داخل کروایا گیا، بہتر سے بہترین تعلیم دلوائی گئی جب اس کی یونیورسٹی جانے کی باری آئی تو ان لوگوں کا انتخاب باہر کے کسی ملک کی یونیورسٹی تھی جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے جس کے لیے ان لوگوں نے اس کو باہر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا لیکن آب اتنے سالوں سے جب ان کا بچہ ان کے ساتھ رہ رہا تھا۔ تو کوئی مسئلہ نہ تھا ان لوگوں کی دنیا بدل گی تھی اب پھر اس کی ان کی زندگی سے نکل جانے کا سوچ کر رات کی نیندیں حرام ہو گئیں کیوں کہ وہ ان کی پوری دنیا تھا۔ اور وہ اس کے جانے سے بہت اداس ہو گئے تھے:

نور العین کو رخصت کر کے جب وہ دونوں گھر پہنچے تو انھیں عجیب سا احساس ہوا۔ نہ صرف دل میں سناٹا تھا، بلکہ دونوں کے دلوں میں بھی ایک تکلیف دہ احساس سا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ آخر نور العین کے آنے سے پہلے بھی تو وہ لوگ اکیلے ہی رہتے تھے، اور بہ ظاہر ایک بھرپور زندگی گزار رہے تھے، لیکن نور العین کی آمد نے جیسے ان کی زندگی مکمل کر دی تھی، اور اب اس کے جانے کے بعد ایک خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ۳۶

جن ماں باپ نے اس بچے پر اپنا سب کچھ لگایا سب کچھ خرچ کیا اُسے اس دنیا میں نام مقام دیا اس کی حفاظت کی، اچھی تعلیم دی اُسی بچے نے ان ماں باپ کے ساتھ اتنا برا کیا انھیں بغیر بتائے باہر کی ایک لڑکی سے پسند کی شادی کر لی۔ یہ خبر اس کے ماں باپ کو اس کے ایک دوست کے ذریعے سے ملی اور یہ ان پر کسی بجلی سے کم نہ تھی ان ماں باپ نے اس پر اپنی زندگی کا سب کچھ لولٹا دیا تھا۔ اپنی توجہ محبت سب کچھ۔ وہی ماں باپ جو اس کے گھر واپس آنے کے دن گن گن کر زندہ تھے۔ وہ اُن کو ٹالے ہی جا رہا تھا اُسے تو ان دونوں کی پرواہ ہی کہاں تھی جب اس کے ماں باپ کو شادی کا پتہ چلا تو:

ماں باپ پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ رضوان صاحب حیرت سے اسے دیکھتے رہے لیکن سائرہ بیگم برداشت نہ کر سکیں۔ انھوں نے دل تھاما اور چکرا کر زمین پر گر پڑیں۔ رضوان صاحب دوڑے۔ وہ لڑکا بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ نوکر چاکر سب جمع ہو گئے۔ رضوان صاحب

کے پڑوس میں رہنے والے ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا اور بتایا کہ انھیں ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے، اس لیے فوری ہسپتال لے جانا ہو گا۔ ایمبولینس بلائی گئی، لیکن ہسپتال جانے سے پہلے ہی سائرہ بیگم ختم ہو گئیں۔ سب کچھ ایک لمحے میں ختم ہو گیا۔[۳۷]

جس بچے کے لیے ان دونوں نے کیا کچھ نہیں کیا اور اس نے کیا کیا اس کی وجہ سے اس کی ماں مر گئی اس کو دیکھنے کے لیے ترستی رہی لیکن وہ نہ آیا اُس نے اپنی دنیا بنالی وہ باہر کی رنگینوں میں ہی مست ہو گیا۔ اب وہ ان ماں باپ کو جنھوں نے اُسے اس مقام تک پہنچایا ان کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ان کی ان قربانیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، وہ سب کچھ بیچ کر باہر ہی رہنا چاہ رہا تھا۔ جس باپ نے اُس ایدھی سنٹر سے نکال کر اس دنیا میں عزت کا مقام دیا اس کی پہچان بنائی۔ اسی بچے نے اس باپ کو ایدھی سنٹر رہنے تک پہنچایا دیا تھا وہ سب کچھ جو اس کے ماں باپ نے اس کے نام کیا تھا وہ سب فروحت کرنا چاہ رہا تھا۔ بے حسی کی انتہا تھی کہ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی اس کی ماں اس کی وجہ سے مر گئی اس کا، باپ اکیلا رہ گیا:

اوہ یہ وہی بچہ ہے جیسے آپ ہم سے لے کر گئے تھے۔ ماشاء اللہ بیس سال میں کیسا خوب رو جوان نکلا ہے۔ آفرین ہے آپ لوگوں پر۔ ایک بے سہارا بچے کی زندگی بنادی۔۔۔۔ اس لیے بیٹا کہ جب تم بے سہارا تھے تو تم اس گھر میں تھے، لیکن آج میں بے سہارا ہو گیا ہوں تو میں یہاں آ گیا ہوں۔ آج سے یہ میرا گھر ہے۔[۳۸]

اس افسانے میں دوہری سطح کی عدم قبولیت نظر آتی ہے۔ جس بچے کے لیے انھوں نے سب کچھ کیا لیکن اس نے آخر کیا کیا۔ معاشرے کی وہ بے حسی جو بچوں کو باہر کے ممالک میں رہنے کی وجہ سے ان کے اندر آجاتی ہے اور وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔

افسانہ "چراغ مردہ ہوں" میں مرکزی کردار ایک عورت کا ہے جو اونچے اور نچلے طبقے کے افراد کا موزانہ کرتی ہے۔ دو مختلف لوگوں کے جنازوں کے ذریعے وہ ایک دن اپنی بے خیالی سے ایک قبرستان پونچ گئی جس میں اُس نے دیکھا ایک بڑا قافلہ قبرستان میں داخل ہوا جس میں ایمبولینس بہت سی گاڑیاں جس کے لیے اتنے زیادہ حفاظتی اقدامات کیے گئے تھے۔ مرنے والے کو فل پروٹوکول دیا گیا تھا، جس کے لیے مسلح سپاہی اس کی حفاظت کے لیے موجود تھے بڑا مختلف سامنظر تھا۔ وہ کتنا بارعب انسان ہو گا جس کو اتنی عالی شان موت نصیب ہو گی:

جس انسان کے بے روح، بے جان، مردہ جسم کی اس قدر عزت و توقیر ہے تو زندگی میں وہ کیا ہو گا، کون ہو گا۔ اس کی زندگی کتنی شان و شوکت سے گزر رہی ہو گی۔ اس کا کتنا دبدبہ ہو گا، کتنا رعب ہو گا۔۔ یقیناً کوئی وزیر، سفیر، جرنل، کرنل یا پھر کوئی بزنس کا ٹائی کون، جس کے سامنے ساری دنیا ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہو گی۔ کیوں نہ ہو۔ جس کے بے جان جسم کی اتنی عزت و توقیر ہو رہی ہے تو اس چلتے پھرتے جان دار انسان کے متعلق تو آپ سوچ ہی سکتے ہیں۔۔[۳۹]

جب وہ اُس شخص پر رشک کھا کر واپس پلٹی تو اس نے دیکھا ایک اور شخص کی لاش تھی جو غربت کی حالت میں تھی جس کو دیکھ کر وہ قدرت کی اس تقسیم پر حیران تھی۔ جس کو بمشکل چار پانچ لوگ لے کر آئے تھے۔ کتنا مختلف سا منظر تھا جس پر سب لوگ اشک بار تھے:

یہ غربت کے مارے ہوئے خستہ حال لوگ ایک ٹوٹی سی چارپائی پر ایک پھٹی پرانی چادر میں لپٹی ہوئی لاش کو لانے والے اس کے دنیا چلے جانے پر آنسو بہا رہے تھے اور وہ جس کے مرنے کے بعد بھی شان و شوکت میں کمی نہیں آئی تھی، اس کے لیے ان سیکڑوں آدمیوں میں سے کسی ایک شخص کی آنکھ بھی اشک بار نہیں تھی۔ کس قدر تضاد تھا۔[۴۰]

یہ افسانہ ان افراد کی عکاسی کرتا ہے جن کی اس دنیا میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ معاشرے میں عدم قبولیت کا شکار رہتے ہیں۔ معاشرے کے اندر ہر جگہ پر ان کو اس چیز کا سامنا رہتا ہے۔ دنیا میں بھی ان کی کوئی حیثیت یا مقام نہیں ہوتا اور ایسی ہی حالت ان کے مرنے کے بعد کی ہوتی ہے۔ معاشرے کے اپنے معیارات ہیں۔ "تضادات پر مشتمل اس معاشرے میں جہاں زندگی گزارنے کی روش، تفریق، امتیاز چھوٹے بڑے طبقوں کی بدبختیوں اور خوش نصیبوں کے الگ الگ رنگ سے مرتب ہو، جہاں چاروں سمت غلامی کی زنجیروں اور زنجیروں کی زد میں کروڑوں انسانوں کی آہیں کراہیں، پاگل ہوا کی طرح فضا میں موجود ہوں، انسانیت بلک کیوں نہ اٹھے۔"[۴۱] جس بری خستہ حالت میں اُس کی میت کو لایا گیا تھا اس سے اس مرنے والے شخص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دوسری طرح اس اونچے طبقے کے اس شخص کی میت شان و شوکت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس کی کیا عالی شان زندگی اس دنیا میں ہوئی ہو گی۔ کیا عالی شان طریقے سے اس کی قبر پر پھول ڈالے گے تھے لیکن اس غریب انسان کی قبر پر ایسا کچھ نہ تھا۔ افسانے کا مرکزی

کردار اکثر ان دونوں قبروں کے بارے میں سوچتا تھا آخر ان دونوں کی قبروں کی کیا حالت ہو گی، وہ اونچے طبقے کے اس شخص کے قبر کے بارے میں سوچتی تھی:

> یقیناً اس کی قبر پختہ کروائی گئی ہو گی، بلکہ اس کے نام اور اعزازات کندہ کرا کے اس کے سرھانے ایک کتبہ آویزاں کرا دیا ہو گا۔ اس کی قبر کو ایک عالی شان مقبرے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہو گا۔ گورکن کو بھی خصوصی ہدایات ہوں گی کہ وہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے جس کے لیے ایک خاص رقم اسے دی جا رہی ہو گی۔ ۴۲

اس دنیا میں معاشرے کے بنائے گے معیارات جن میں اونچے طبقے کی قبولیت تو ہے لیکن نچلے طبقے کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن اللہ کے ہاں تو ایسے معیارات نہیں ہوتے اس کی نظر میں سب ہی برابر ہوتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کی رونقوں میں گم ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی زندگی مرنے کے بعد ویسی شاندار نہیں ہوتی۔ قبرستان میں ان کی عدم قبولیت واضح نظر آتی ہے، وہ لوگ جو معاشرتی حوالے سے بلند مقام رکھتے ہیں ان کی عدم قبولیت نمایاں ہوتی ہے:

> آخر کار کافی دیر تک تلاش کرنے کے بعد اس جگہ پہنچ گئی جس جگہ وہ قبر تھی، جس کی مجھے تلاش تھی۔ ایک پختہ سی قبر۔ جس کے سرھانے ایک کتبہ بھی لگا ہوا تھا، لیکن قبر کے آس پاس روکھی جھاڑیاں۔ خشک پتے اُڑتے ہوئے، چاروں طرف ویرانی۔ زندگی میں جس کی حفاظت کے لیے اتنے پہرے دار تعینات رہتے تھے، جس انسان کو اپنی زندگی میں اپنے جیسے انسانوں سے خوف آتا تھا اب اس قبر کے اندر کس قدر بے خوف و خطر آرام کر رہا تھا۔ ۴۳

دوسری طرف ایسے لوگ جن کو کہ معاشرے میں کوئی مقام و مرتبہ نہیں ہوتا، جن کی قبولیت نہیں ہوتی کیوں کہ ان کی حیثیت ایک غریب کی سی ہوتی ہے۔ ایسے افراد کو معاشرہ کچھ نہیں سمجھتا۔ اس غریب کے بارے میں اکثر سوچتی تھی۔ جس کی میت کی اتنی بری حالت تھی، تو اس کی قبر کی حالت کیا ہو گی۔ عین ممکن ہے کہ دھنس چکی ہو گی پھر وہ ڈھونڈتی ہوئی اس قبر تک پہنچی:

> قبر کچی ضرور تھی، لیکن ارد گرد چھوٹے چھوٹے خودرو پھولوں کے پودے۔ قبر کے آس پاس ایک خوش بو ایک مہک، ایک سکون اور طمانیت کا احساس۔ نہ قبرستان کی ویرانی، نہ انسان کی بے

بسی، نہ وحشت نہ خوف۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑی رہی۔ پھر ایک زہر خند مسکراہٹ میرے
ہونٹوں پر آئی۔ شاہد قدرت خود اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ ۴۴

افسانے کے آخر میں ان افراد کی عکاسی کی گی ہے، جن کو دنیا میں تو قبول نہیں کیا جاتا مگر ان کو اللہ اکیلا نہیں چھوڑتا۔ ان کو عزت کے ساتھ مرنا ہی نصیب ہو جاتا ہے۔

شعبہ جاتی عدم قبولیت

افسانہ "یونس بھائی" کا مرکزی کردار یونس بھائی ہیں، اور ان کی شخصیت کی عدم قبولیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یونس بھائی کا کردار سکول کے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے اس شخص کا ہے جو بچوں کے لیے کاغذ کے دستے، پینسلیں، ربڑ، شاپنرز، سکیل، پینسل باکس ہر وہ چیز جو بچوں کو پڑھائی میں مدد دیتی ہے بیچتا ہے۔ اس کی غربت کی وجہ سے معاشرے میں عدم قبولیت ہے۔ وہ اپنے بھائی، بھاوج کے گھر رہتا تھا۔ اور وہ بھی اس کو قبول نہیں کر پا رہے تھے کیوں کہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے، کچھ کماتا نہیں تھا غریب تھا۔ سماج کے اندر لوگوں کی بے حسی کی انتہا ہے۔ جیسے ان کے گھروں کے اندر ان کے اگر ماں باپ بہن بھائی توجہ کے محتاج ہیں تو وہ کبھی ان کی مدد نہیں کرئے گے، نہ ان کی ضرورت کا خیال رکھیں گے۔ اس طرح افسانے میں یونس بھائی کے کردار کے ساتھ ان کے بھائی بھاوج نے وہی سلوک کیا اور غربت کے باعث قبول نہیں کیا:

میرے بھائی بھاوج نے مجھے نکال دیا ہے حالانکہ وہ بہت مال دار ہیں۔ میری بھاوج کا کہنا ہے کہ
چونکہ میں کچھ کماتا نہیں ہوں اس لیے وہ میری ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔ اصل میں میری صحت
زیادہ اچھی نہیں رہتی ہے، اس لیے میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ لیکن اب میں نے سوچ لیا ہے کہ
میں محنت مشقت کروں گا۔ ان پر بوجھ نہیں بنوں گا۔ ۴۵

معاشرے میں لوگوں کی بے حسی کی وجہ سے کوئی کسی کے درد و غم میں شریک نہیں ہوتا، لوگوں کو کسی کے معاملات سے کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ کوئی بھوک سے سردی سے مرے اس سے کیا فرق پڑھتا۔ یونس بھائی کا کردار بہت محنتی اور قابل شخص ہے جو ہر ایک کی مدد کرتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کی معاشرے کے اندر کوئی حیثیت نہیں حالانکہ وہ ہر

کام کا ماہر ہے۔ جب اس کو ہیڈ مسٹریس سے سکول کے باہر دکان لگانے کی اجازت ملی تو دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی محنت سے ہر کام کر رہا تھا:

> وہ وہاں کتنی صبح آجاتے تھے اور شام تک دوسری شفٹ ختم ہو جانے کے بعد کب تک وہاں رہتے تھے کبھی پتا نہ چلا اور اسی طرح خاصہ عرصہ گزر گیا۔[۴۶]

یونس بھائی کے اندر ہر طرح کی خوبی موجود تھی، ہر ایک کے کام آنے والے ہر ایک کی مدد کرنے والے اس کے باوجود کوئی ان کی حیثیت کو قبول نہیں کرتا وہ پرنسپل سے لے کر استاد، بچوں حالانکہ وہ چپراسی تک ہر ایک کے ساتھ مددگار کے طور پر حاضر رہتے تھے۔ ان کے بغیر کسی کا کوئی کام پورا نہیں ہوتا اس کے باوجود ان کی اپنی شناخت، اپنی اہمیت نہیں تھی۔ سماج میں لوگوں کا ایسا رویہ ہے جس سے انھیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ حمراء خلیق طبقاتی کشمکش کے متعلق کہتی ہیں:

> ہمارے معاشرے میں جو محنت کش طبقہ ہے اسے آگاہی ہونی چاہیے، لیکن انھیں آگاہ نہیں ہونے دیا جاتا۔ انھیں پڑنے لکھنے سے دور رکھا جاتا ہے، انھیں آواز اٹھانے ہی نہیں دی جاتی اُس سے پہلے ہی گلہ گونٹ دیا جاتا ہے۔ ابھی تھوڑا احساس ان کے اندر بیدار ہوا ہے لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے اس ڈر سے کہیں طبقاتی موت نہ مارے جائیں۔[۴۷]

جہاں توجہ طلب معاملات ہوتے ہیں وہاں بھی لوگ خود کو لاتعلق کر دیتے ہیں۔ ایسے جیسے انھیں کوئی فرق ہی نہیں پڑھتا۔ یونس بھائی نے سب کی ذمہ داریاں اٹھا رکھی تھیں ہر ایک کا کام کرنا ان کی ذمہ داری میں شامل تھا مگر کسی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی:

> اگر کوئی دوسرے کاموں میں مصروف ہے تو کوئی بات نہیں۔ یونس بھائی ہر کام کے لیے حاضر ہیں۔ کسی ٹیچر کو کوئی چیز منگانا ہے، یونس بھائی بسر و چشم تیار۔ بہت بڑا اسٹاف ہونے کی وجہ سے ہاف ٹائم میں ناشتا وغیرہ لانا ایک چپراسی کے بس کا نہیں۔ یا وہ کسی اور کام میں مصروف ہے، کیا فکر ہے یونس بھائی تو ہیں۔ دس ٹیچرز ناشتا منگا رہی ہوں یا بیس، یونس بھائی سب کا سامان لانے کو تیار۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کا منایا ہوا سامان غلط ہو گیا ہو یا حساب میں ایک پیسے کی بھی غلطی ہو گئی ہو۔[۴۸]

وہ ایک امانت دار شخص تھے جو ہر ایک کے پیسے کا صحیح حساب کر کے ہر ایک کو واپس کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ مگر ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ ان کے جذبات کی کوئی قدر نہ تھی۔ ان کی نظر میں وہ ایک مشین تھے۔ جو ہر وقت کام کرتی تھی۔ سب کی نظر میں ٹھیک ہے جیسے بھی چل رہا ہے اس سے کیا فرق پڑھتا ہے۔ وہ کیسا ہے کس طرح چل رہے ہیں۔ ان کے جذبات کی اہمیت کسی کی نظر میں نہ تھی:

> کچھ دنوں سے یونس بھائی میں ایک نمایاں تبدیلی آنے لگی تھی۔ وہ خلاف معمول نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنے لگے تھے۔ ربڑ کی دوپٹی کی چپل کی جگہ چمڑے کی پالش شدہ سینڈل نے لے لی تھی۔ چہرے پر خوشی کی لہر اور آنکھوں میں ایک چمک سی رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی وہ خود مسکراتے ہوئے بھی نظر آتے تھے سب ہی نے اس تبدیلی کو محسوس کیا لیکن کسی نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ۴۹

افسانے میں یونس بھائی کا کردار ہی بحیثیت عموعی عدم قبولیت کا شکار ہے۔ وہ کام کرتے رہے تو سب ٹھیک ہے ان کے جذبات واحساسات سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ وہ خوش ہیں یا غم زدہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ دونوں صورتوں میں کام پر آرہے ہیں۔ فرق تب پڑھتا جب سب کو ان کا کام نہ ملے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ لہذا کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور نہ ہی کسی نے کوئی سوال کیا۔ معاشرے میں بے حسی کی انتہا ہو چکی تھی کسی کو کسی کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی کیسے مرا، گولی سے مرا یا کسی اور وجہ سے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی کی عزت پامال ہو ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو سب روز کا معمول ہے۔ فرق تب پڑتا ہے جب خود پر گزرے۔ اس طرح یونس بھائی کی شخصیت کی کوئی اہمیت نہیں ان کی شخصیت کی عدم قبولیت واضح ہے:

> ان کی آواز بھرائی ہوئی اور گلا رُندھا ہوا تھا۔ چہرے پر ایک کرب تھا۔ ان کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ نہ اس وقت اور نہ پھر کبھی کسی نے ان سے سوال کیا کہ "فالٹ" کس میں اور کیا نکل آیا۔ کچھ دنوں تک ہر شخص اپنی اپنی جگہ افسوس کرتا رہا۔ ان پر ترس کھاتا رہا لیکن پھر سب بھول بھال گئے۔ ۵۰

افسانے میں ہر جگہ عدم قبولیت کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کے جذبات واحساسات کی بھی کوئی اہمیت نہیں، ان کی اپنی شخصیت ہی بے معنی ہے۔ جب ان کی شادی نہیں ہوتی تو وہ بہت دن پریشان رہتے ہیں، اس معاملے میں بھی کوئی بندہ

ان سے سوال ہی نہیں کرتا، وہ کسی کے لیے اہم ہی نہیں ہیں۔ کوئی ان سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتا کہ ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی، نہ ہونے کی وجہ کیا بنی ہر جگہ ان کی عدم قبولیت نظر آتی ہے۔ ان کے جذبات واحساسات کی بھی معاشرے کے اندر عدم قبولیت ہے۔ سکول کے اندر بھی ان کی عدم قبولیت پائی جاتی ہے۔ کوئی بھی شخص ان کی حیثیت کو قبول نہیں کر پا رہا، کوئی بھی ان کے غم کا مداوا کرنے کی کوشش نہیں کرتا کیوں کہ یہ ہر کسی کو غیر ضروری لگتا ہے۔

افسانہ "دیکھ کبیر ارویا" کے اندر مارکسی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ معاشرے کے نچلے طبقہ کی ان چھوٹی چھوٹی خواہشات پر ہے جو ان کے لیے تو بڑی ہوتی ہیں لیکن باقی معاشرے کی نظر میں ان کی اہمیت نہیں ہوتی۔ افسانے کا مرکزی کردار جامو کا ہے جو ہسپتال میں بطور اسٹریچر بردار کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ بہت حساس تھا، کسی کا دکھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہر ایک کے کام آنے والا، مشکل کے وقت ان کے غم، دکھ میں شریک ہونے والا ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنے والا تھا۔ اسے اپنے مریضوں کی سب سے زیادہ پرواہ تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود اس کی کوئی حیثیت نہیں، کوئی اس کی پہچان نہیں۔ معاشرے میں اس کی کوئی شناخت نہیں، اتنی محنت کے باوجود کوئی اُسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا:

> جامو کی دن کی ڈیوٹی ہوتی یا رات کی وہ یہ کبھی نہیں سوچتا تھا۔ وہ ہر موقعے پر حاضر رہتا تھا۔ اس کے ساتھی اس کا مذاق اڑاتے تھے، اسے بے وقوف اور پاگل سمجھتے تھے اور بعض اس سے جلتے بھی تھے۔ "عجیب احمق ہو یار، ڈیوٹی ختم ہوتی ہے پھر بھی کام کرتے رہتے ہو"۔۔۔ "یار کچھ تو فائدہ ضرور ہو گا، ورنہ کون ایسا بے وقوف ہو گا"۔ ۱۵

وہ اتنے اچھے دل کا مالک ہونے اور ہر ایک کا خیال رکھنے کے باوجود کوئی اس کے لیے اچھا نہ سوچتا اور نہ ہی کوئی اس کو قبول کرتا ہے۔ لیکن وہ بھی خاموش ہو کر رہتا تھا، اس کے جذبات اور احساسات اور طرح کے تھے۔ جب اس کی ماں اور اس کے باقی دوست اُسے شادی کے لیے مجبور کر رہے تھے تو وہ شادی کے لیے بھی بار بار انکار کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کی معاشرے میں کوئی شناخت ہی نہیں، نہ رہنے کے لیے کوئی جگہ ہے اس لیے وہ سوچتا ہے کہ ایسے میں تو میں ایک اور انسان کو بے یار و مددگار رہنے کے لیے اس معاشرے میں نہیں لا سکتا۔ میں نہیں چاہتا وہ بھی میری طرح کی بے نام زندگی گزارے۔ پھر اس کے کچھ دوستوں نے اسے حوصلہ دیا، اسے شادی کے لیے راضی کیا۔ جس میں ایک

نان والا اور ایک گھوڑا گاڑی والا شامل تھے۔ ان لوگوں کی اونچے طبقے کے پاس مجبور و بے کس مکینوں کی ایک دنیا تھی۔ مصنفہ نے ان بے شناحت لوگوں کی ایک پوری دنیا افسانے کے اندر دکھائی ہے۔ ان لوگوں کی بھی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں جن کو مناتے ہیں، جن کے سہارے جیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے، اونچے طبقے کا خوشی منانے کا انداز الگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے لاکھوں، کروڑوں اپنی خواہشوں پر خرچ کرتے ہیں جبکہ نچلا طبقہ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھ کر خوشاں مناتا ہے۔ اصل میں خوشی کا تعلق دل سے ہوتا ہے، خوشی دلی اطمینان کے ساتھ ہی منائی جاسکتی ہے۔ افسانے میں بھی ان کی خوشی کا انداز دیکھا گیا ہے:

> گھوڑا گاڑی والا، نان بائی، دھنیا اور اس کی بیوی بیٹی سب اس نئے آنے والے مہمان کے استقبال کی تیاری میں لگ گئے۔ غفورے نے دن رات ایک کر کے اپنی جھونپڑی کی صفائی کی، اس کی کچی دیواروں پر اپنے ہاتھ سے سفیدی کی۔ دھنیا کی بیوی اور بیٹی رنگ برنگے کاغذوں سے جھنڈیاں کاٹ کاٹ کر جھالریں لٹکائیں۔ نانبائی نے نئے دلہا دلہن کی دعوت اپنے ذمے لے لی۔ ۵۲

نچلے طبقے کے لوگ اپنی خوشیاں بے شک چھوٹے پیمانے پر مناتے ہیں اور اپنی چھوٹی سی دنیا میں ہی وہ خوش رہتے ہیں۔ وہ جس اونچے طبقہ کے درمیان وہ رہ رہے ہوتے ہیں، ان کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی حالانکہ وہ ان کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ اپنے فرئض کی انجان دہی کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی، وہ نچلے طبقے کو قبول کرنے کے لیے ہی تیار نہیں ہوتے۔ ان کی نظر میں ان کی خوشیوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی، وہ ان سب سے الگ اپنی ایک حسین دنیا بنائے بیٹھے ہوتے ہیں:

> ان کی دنیا کتنی عجیب تھی۔ نہ عطر و عنبر کی خوش بو، نہ چنبیلی، گلاب کے پھولوں کی مہک، نہ اطلس و کم خواب کے لباس، نہ حریر و دیبا کے ریشمی ملائم کپڑے، مگر وہ دونوں کس قدر خوش تھے، جامو کو تو جیسے جہاں بھر کی دولت مل گئی تھی۔ اسے اب کسی چیز کی تمنا نہیں تھی، گل جان اس کی دولت تھی اور گل جان بھی جامو کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی، مادی دولت نہیں تھی تو کیا محبت کی انمول دولت تو انھیں حاصل تھی۔ ۵۳

نچلا طبقہ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بڑے احسن طریقے سے مناتا ہے۔ پھر ایک دن جامو کو یہ خبر ملی کہ وہ باپ بننے والا تھا، وہ دن اس کی خوشی کا دن تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کا نام ہسپتال میں لکھوا دیا تھا وہ

چاہے تھا اس کا بچہ بھی کسی عام ہسپتال میں پیدا نہ ہو بلکہ کسی بڑے ہسپتال میں آنکھ کھولے ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب ہر شخص کے اپنے بچوں کے لیے بڑے بڑے خواب ہوتے ہیں۔ جن کو پورا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے دن رات محنت کرتا ہے۔ اس طرح جامو کی بھی خواہش تھی اس کا بچہ اُس بڑے ہسپتال میں آنکھ کھولے جہاں وہ کام کرتا ہے:

> دھنیا کی بیوی اکثر جامو سے کہتی، "بھیا! اتنے بڑے ہسپتال کے چکر میں نہ پڑ، کہاں سے لائے گا اتنا پیسا برا نہ مانیو، میں کہتی ہوں کسی چھوٹے ہسپتال میں دکھادے لے جا کہ۔ بھابی کاہے کو پریشان ہوتی ہو، میں اس ہسپتال میں چھ سال سے ملازم ہوں، سب بڑے ڈاکٹر ڈاکٹرنیاں مجھے جانتی ہیں، آدھی رات کو بھی جاؤں گا انکار نہیں کرے گا کوئی"۔۔۔ تو کہتا ہے بھیا، لیکن مجھے تو ان بڑے ڈاکٹروں کا کوئی اعتبار نہیں، اللہ جانے وخت پر کیا دماغ دکھانے لگیں اور پھر ان کی اتنی اتنی بڑی بڑی فیس کیسے بھرے گا۔ "واہ بھابی میں وہیں کا نوکر ہوں، مجھے کیا دماغ دکھائیں گے۔
>
> ۵۴

اسے اپنے ہسپتال والوں پر بڑا بھروسہ تھا۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا اس معاشرے کے اونچے طبقے کے افراد کی نظر میں نچلے طبقہ کیڑے مکوڑوں کی طرح ہے۔ یہ معاشرہ اپنی برابری کرنے والوں کو کبھی قبول نہیں کرتا تو جامو کی بیوی کو کیسے قبول کرتا۔ جس رات جامو کی بیوی کی طبیعت خراب ہوئی، اس کی ڈیوٹی ہسپتال میں تھی اور اس دن ڈاکٹر مسز عظیم کے ایمرجنسی آپریشن کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس وقت ہر ایک شخص کی توجہ ان کی طرف تھی۔ کون جامو کہاں کا جامو کسی کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا:

> "ڈاکٹر صاحب وہ میری" "ہاں، ہاں دیکھ لیں گے اسے بھی، تم دیر نہیں کرو، مریضہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے" "ڈاکٹر صاحب میری بیوی" "اوہ یو، ایڈیٹ" ۵۵

اس وقت معاشرتی بے حسی انتہا پر دکھائی گئی ہے کہ وہ شخص جو اتنے سالوں سے وہاں اپنی ڈیوٹی سر انجام دے رہا تھا جو اتنا ہمدرد دل رکھنے والا انسان ہر ایک کی ایک آواز پر حاضر ہونے والا اس وقت بے بسی کی حالت میں کوئی اُسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے عہدے، اس کی حیثیت کی وجہ سے، حالانکہ وہ اپنی ڈیوٹی باقی سب کی طرح پوری نباہ رہا تھا۔ اپنے باقی عہدے داران کی طرح چونکہ اس کا عہدہ اس کی حیثیت قابل قبول نہیں ہے، اس

معاشرے کے اندر وہ کیسے ان سب کی برابری کر سکتا ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ قابل رحم انسان اس دنیا میں نہیں تھا لیکن کوئی اس پر رحم نہیں کر رہا تھا:

> غفورے کو بمشکل ایک نرس ہاتھ لگی۔۔۔ "خدا کے لیے مسٹر رحم کرو، یہ مر جائے گی، بچہ مر جائے گا، یہ جامو کی بیوی ہے، جو تمھارے ہسپتال میں چھ سال سے۔۔۔ "زیادہ بک بک نہ کرو، دیکھ رہی ہوں بابا، اسے لیبر روم میں لے چلو"۔۔۔ لیبر روم کی ضرورت ہی نہیں تھی۔۔۔ نرس نے گل جان کے اوپر چادر ڈال دی، ہسپتال کا برآمدہ اندوہناک چیخوں سے گونج اٹھا۔۔۔ "۵۶

آخر میں جامو کا کردار ایک ہارے ہوئے شخص کا ہے۔ جو سب کچھ کرنے کے باوجود اپنی دنیا اُجاڑ چکا تھا۔ حمراء خلیق اس افسانے کے بارے میں کہتی ہیں۔

> اکثر افسانوں میں مجھے اپنا آپ نظر آتا ہے جیسے "دیکھ کبیر ارویا" اس شخص کی بیوی ہسپتال میں مر گئی قابل حیثیت نہ ہونے کی وجہ سے، میں محسوس کرتی ہوں اس کی جگہ میں ہوتی تو کیا ہوتا میں بھی تو ہو سکتی تھی۔۵۷

اس کو معاشرے نے قبول نہیں کیا۔ اُسے جو جگہ ملنی چاہیے تھی نہیں مل سکی نہ اس کی کوئی پہچان بن سکی۔ وہ سب کچھ ہار گیا اس نے اپنی گل جان کو ہار دیا۔ لیکن یہ معاشرہ جیت گیا اس کی بنائی گی اقدار جیت گئیں۔

کارل ماکس کے نظریہء (Alienation) عدم قبولیت کے تناظر میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے معاشرے میں انسانوں کی تقسیم دو طرح کے طبقات کی صورت میں ہوئی ہے ایک بورژوئی اور دوسرا مزدور طبقہ جو زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہے۔ اس طبقے کو کو بنیادی ضروریات زندگی بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ برسر اقتدار طبقے مزدور طبقہ کو کسی صورت قبول نہیں کر پاتا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر شخص دوسرے سے بیگانہ ہے۔ انسان کی انسان سے، فرد کی سماج سے، سماج کی فرد سے اور سب سے بڑھ کر انسان کی خود اپنی ذات سے عدم قبولیت کا اظہار ہوتا نظر آتا ہے۔ ایک مزدور پورا دن محنت کے باوجود اگر وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں لا سکتا تو پھر اس کی معاشرے کے اندر کوئی قبولیت نہیں۔ اس کو اس معاشرے میں اپنی مرضی سے

جینے کا حق، اپنی مرضی سے خوشیوں کو منانے کا حق اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک مزدور ہے۔ معاشرے نے ذات پات کی تقسیم کر کے انسانوں سے اُن کے جینے کا حق چھین رکھا ہے۔ یہ سب متوازن طبقاتی تقسیم سے جنم لینے والے مسائل ہیں۔ معاشرے میں موجود قدروں کو وضع کرنے والے، انسانوں کے لیے اتنے وسائل ہی پیدا نہیں کرتے جن سے وہ اپنے بیوی بچوں کو پال سکیں۔ ان کی وجہ سے معاشرے میں غربت، افلاس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

معاشرے میں اس طرح کی اقدار وضع ہو چکی ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ بچوں کا رویہ دن بدن برا ہوتا جاتا ہے۔ بچہ جب سے پیدا ہوتا ہے اس کی پرورش کی خاطر ماں باپ محنت، مشقت برداشت کرتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی، صحت مند ہوں یا بیمار وہ اپنی اولاد کی خاطر، اس کے اچھے مستقبل کی خاطر، ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتے ہیں لیکن جب بچوں کی باری آتی ہے تو وہ انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

غربت کی وجہ سے نچلے طبقے کے ہاں کھانے کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب تب سمجھ آتا ہے، جب ان آس بھری آنکھوں کی طرف دیکھا جائے جو سوال کرتی ہیں نچلے طبقے کے حالات کبھی بدل نہیں سکتے، وہ خواب تو دیکھتے ہیں مگر ان کو خوابوں کی تعبیر نہیں ملتی۔ اس لیے ان کی سوچوں کی حدود ہی محدود ہوتی ہے۔ وہی دو وقت کی روٹی، نچلے طبقے کا بڑا المیہ تلاش معاش تو ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ اُن بیماریوں، پریشانیوں، مصیبتوں نے انھیں الگ گھیرا ہوتا ہے۔ گھر کا ایک فرد اگر کما رہا ہے، تو اس کے ساتھ اگر کوئی مسئلہ پیش آجائے تو پورا گھر مصیبتوں کی نظر ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف عورت کے حوالے سے دیکھا جائے تو مرد معاشرے میں سب سے چھپ کر عورت کے ساتھ تعلقات تو بنالیتا ہے مگر جب اس کو معاشرے میں عزت و مقام دینے کی بات آتی ہے تب وہ معاشرے میں اپنی جھوٹی عزت کی خاطر خاموش ہو جاتا ہے۔ عورت مرد کے لیے چاہے جتنا بھی خوشی کا سامان پیدا کر لے وہ کبھی بھی اس کو وہ مقام و مرتبہ نہیں دیتا جس کی وہ حق دار ہے کیوں کہ وہ اسے کسی اور روپ میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔
معاشرے میں لوگوں کی بے حسی کی وجہ سے کوئی کسی کے درد و غم میں شریک نہیں ہوتا، لوگوں کو کسی کے معاملات سے کوئی فرق نہیں پڑھتا۔ کوئی بھوک سے سردی سے مرے اس سے کیا فرق پڑھتا۔ جس اونچے طبقہ کے درمیان وہ رہ رہے ہوتے ہیں، ان کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی حالانکہ وہ ان کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ

اپنے فرئض کی انجان دہی کر رہے ہوتے ہیں، انھیں غریب اور بے بس طبقے کی زندگیوں کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ ان کے لیے اپنے معاشی معیارات اور مادی زندگی زیادہ اہم ہے۔ غریب کے مسائل اور ان کی ضروریات کو سمجھنا انھیں وقت کا ضیاع لگتا ہے۔ اس لیے نچلا طبقہ ہمیشہ ان کی ترجیحات سے خارج رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱. حمراء خلیق،مڑگاں تو کھول(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۰۴ء)،ص۱۱۔

۲. الضاً،ص۱۱۔

۳. الضاً،ص۱۲۔

۴. الضاً،ص۱۲۔

۵. الضاً،ص۱۲۔

۶. الضاً،ص۱۳۔

۷. ادیباہاشم،حمرا خلیق کی ادبی خدمات۔غیر مطبوعہ مقالہ ایم۔فل(ملتان:دی ویمن یونیورسٹی،۲۰۲۷ء)،ص۸۲۔

۸. پروفیسر صغیر افراہیم،اردو افسانہ تعریف، تاریخ اور تنقید(نئی دہلی:براؤن بک پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)،ص۱۶۴۔

۹. حمراء خلیق،مڑگاں تو کھول،ص۱۵۔

۱۰. الضاً،ص۲۹۔

۱۱. الضاً،ص۳۰۔

۱۲. الضاً،ص۳۱۔

۱۳. ڈاکٹر سیما صغیر،ترقی پسند اردو-ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ(علی گڑھ:مسلم ایجوکیشنل پریس،۲۰۱۰ء)،ص۹۱۔

۱۴. حمراء خلیق،مڑگاں تو کھول،ص۳۲۔

۱۵. الضاً،ص۳۵۔

۱۶. الضاً،ص۳۵۔

۱۷. ہلال احمد وانی،مارکسزم اور اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔غیر مطبوعہ مقالہ پی-ایچ-ڈی(سرینگر:شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی حضرت بل،۲۰۱۵ء)،ص۲۵۔

۱۸. حمراء خلیق،مڑگاں تو کھول،ص۳۶۔

۱۹. الضاً،ص۳۷۔

۲۰. الضاً،ص۳۷۔

۲۱. الضاً،ص۳۸۔

۲۲. ایضاً، ص۳۹۔

۲۳. ایضاً، ص۴۱۔

۲۴. ایضاً، ص۱۷۔

۲۵. ایضاً، ص۱۸۔

۲۶. ایضاً، ص۱۸۔

۲۷. ڈاکٹر سیما صغیر، ترقی پسند اردو-ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ، ص۹۲۔

۲۸. حمراء خلیق، مڑگاں تو کھول، ص۱۸۔

۲۹. https://n/pd.gov.pk/uakhbareurdu/DecJanuary2014/jan-12.html بخت مینر صاحب آبادی "ہمارا معاشرہ اور منٹو" تاریخ ۲۰۲۲-۰۲-۲۵، بوقت ۱۲:۲۵۔

۳۰. حمراء خلیق، مڑگاں تو کھول، ص۱۹۔

۳۱. ایضاً، ص۱۹۔

۳۲. حمراء خلیق، بادلوں کی اوٹ (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۲۰ء)، ص۱۰۱۔

۳۳. ایضاً، ص۱۰۲۔

۳۴. ایضاً، ص۱۰۳۔

۳۵. ایضاً، ص۱۰۴۔

۳۶. ایضاً، ص۱۰۶۔

۳۷. ایضاً، ص۱۰۸۔

۳۸. ایضاً، ص۱۱۱۔

۳۹. ایضاً، ص۷۷۔

۴۰. ایضاً، ص۷۷۔

۴۱. ڈاکٹر اعجاز راہی، اردو افسانہ میں اسلوب کا آہنگ (راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۳ء)، ص۱۰۹۔

۴۲. حمراء خلیق، بادلوں کی اوٹ، ص۷۸۔

۴۳. ایضاً، ص۷۹۔

۴۴. ایضاً، ص۸۰۔

۴۵. حمراء خلیق، مڑگاں تو کھول، ص۲۱۔

۴۶. الضاً، ص۲۲۔

۴۷. حمراء خلیق، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، ۱۴ ستمبر ۲۰۲۱ء دوپہر ۳ بجے۔

۴۸. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص۲۱۔

۴۹. الضاً، ص۲۳۔

۵۰. الضاً، ص۵۰۔

۵۱. الضاً، ص۷۵۔

۵۲. الضاً، ص۶۶۔

۵۳. الضاً، ص۶۹۔

۵۴. الضاً، ص۷۱۔

۵۵. الضاً، ص۷۲۔

۵۶. الضاً، ص۷۳

۵۷. حمراء خلیق، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، ۱۴ ستمبر ۲۰۲۱ء دوپہر ۳ بجے۔

باب سوم

بالائی ساخت کے تناظر میں حمراء خلیق کے افسانوں کا مارکسی مطالعہ

معاشرتی تقسیم سے مراد معاشرے میں موجود طبقات کا ایک دوسرے کے حوالے سے معاشی سطح پر تحفظات کا اظہار ہے۔ یہ طبقاتی نظام افراد کے ذہنی رویوں اور ان کی فکر کو ترتیب دیتا ہے۔ عمومی تناظر میں جب ہم معاشرتی تقسیم کو دیکھتے ہیں تو یہ دو طرح کی ساخت سے تشکیل پاتی ہے۔ ایک طبقہ زیریں ساخت اور دوسرا بالائی ساخت۔ اس باب کے اندر حمراء خلیق کے افسانوں کا مطالعہ مارکسی نظریہ بالائی ساخت کے تناظر میں کیا جائے گا۔

معاشرے کا دوسرا با اختیار طبقہ جیسے کارل مارکس نے بالائی ساخت کے نام سے واضع کیا ہے اس کے ہاتھ میں معاشرے کا پورا سماجی ڈھانچہ ہے اور معاشرہ اس پر انحصار کرتا ہے۔ یہی معاشرے کے لیے اس کے معیارات کا تعین کرتے ہیں۔ معاشرے میں موجود شعبہ جات جن کے پاس اپنی اجارہ داری ہے اُسے قائم کرنے کا حق ہے۔ کسی بھی طرح کے ادارے کی تشکیل کا انھیں حق حاصل ہے۔ یہی سپر اسٹرکچر کے ٹھیکیدار ہیں۔ وہ خود کو اتھارٹی سمجھتے ہیں۔ نچلا طبقہ جتنی مرضی محنت کرلے جتنا مرضی کام کرلے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ نچلا طبقہ کوئی بھی فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتا اسے وہی کرنا ہو گا جس کا اسے حکم ملا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی محنت کے معاوضے کا تعین بھی نہیں کر سکتا۔ انہیں اتنی اجرت وصول کرنی ہوتی ہے جس کو بالائی ساخت نے مقرر کیا ہوتا ہے۔ خورشید انور طبقات کے تضادات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> نظاموں میں تبدیلی مختلف نوعیت کے تضادات کی بناء پر ہوتی ہے۔ سماجی ارتقاء کے ہر دور میں متضاد قوتیں موجود رہتی ہیں جو کہ سماج کو مختلف دھاروں میں بہانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مثلاً جہاں ایک طرف حکمران طبقہ نظام کو بدستور قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے وہیں دوسری

جانب اس کے مخالف طبقے نظام میں تبدیلی لانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں طبقوں کی تقسیم
فطری طور پر سماج کو ایک سماجی کشمکش کی طرف مائل کرتی ہے۔[1]

حمراء خلیق کے افسانے "چشم خون بستہ سے۔۔۔بالائی ساخت کے تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ افسانہ معاشرے کے دوسرے طبقے کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک مصور کا ہے۔ جس نے ایک خوبصورت تصویر بنائی تھی جس کے لیے اسے ایک ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس کی قدر و قیمت جان سکے، اس کی تصویر کو وہ مقام دے سکے جس کی وہ حق دار ہے۔ اس کے پاس بے شمار لوگ آئے ہر ایک اسے اپنے گھر کی زینت بنانے کی خواہش ظاہر کرتا۔ ہر ایک اس کی تخلیق کی تعریف کرتا اور اسے پانے کی تگ و دو کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو اس سے زیادہ اس سے پیار کرے اس کا خیال رکھے:

یہ تخلیق اس کی ذات کا حصہ تھی۔ یہ وہ خود تھا اور کوئی خود کو اتنی آسانی سے نہیں بیچتا۔ اس کو
فروخت کرنے کے لیے کسی مناسب ترین گاہک کا ہونا ضروری تھا۔[2]

بالائی ساخت معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو اپنی مرضی کے مطابق نچلے طبقے کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ اس کے لیے ہر ایک چیز کا تعین اپنی مرضی سے کرتا ہے اس سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ خوش ہیں یا نہیں لیکن انھیں ان کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ کوئی بھی چیز حاصل کر سکتے ہیں، کوئی انھیں انکار نہیں کر سکتا کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ انھیں انکار کرے۔ وہ اپنی مرضی کا فیصلہ کروانے کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ اس طرح افسانے میں ایک شخص کو اس کی تصویر پسند آگئی تو وہ روز اس تصویر کو دیکھتا ہے اور اسے خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے ظاہر کرتا جیسے اس سے بڑا کوئی دعوے دار نہیں:

میں آپ کی تخلیق کو بہت نمایاں مقام دوں گا۔ پوری دنیا میں اس کی نمائش ہو گی، اس کی تعریف
ہو گی۔ لوگ دیکھیں گے، سراہیں گے۔ ایسی لاجواب چیز کو دنیا سے چھپا کے رکھنے سے کیا فائدہ۔
آپ کو خوشی نہیں ہو گی جب پوری دنیا میں لوگ اسے پسند کریں گے۔ اس کی تعریف کریں
گے۔" وہ دنوں اس کو ٹالتا رہا۔ خریدار کی نظروں میں ایک عاجزی اور التجا ہوتی۔"[3]

اونچا طبقہ جب چاہے جس طرح چاہے اپنا مفاد حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ وہ اس قدر مفاد پرست ہیں کہ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کسی شخص کی کسی چیز سے کتنی یادیں وابستہ ہیں یا اس کی زندگی میں اس چیز کی کیا

اہمیت ہے وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ کوئی کسی چیز کے سہارے جیتا ہے یا مرتا ہے انھیں اس کی کوئی پروا نہیں، انھیں جو پسند ہے انہوں نے وہ ہر صورت حاصل کرنا ہے۔ "انسانی سماج میں بے انتہا تغیر آیا۔ انسانی معاشرہ بھی مشینی ہوتا چلا گیا۔ جذبات، رشتے، تعلق، پڑوس، معاشرہ، سماج وغیرہ کا پاس اور احترام ہوتا گیا۔ اپنی بات، اپنا فیصلہ اور اپنا اقدام صحیح اور بہتر لگتا ہے جب کہ دوسرے کی ہر بات غلط۔ یہیں سے خود پرستی کی ابتدا ہوتی ہے۔ خود پرستی سے فرقہ پرستی، علاقہ پرستی اور مذاہب پرستی سماج میں برق رفتاری سے پھیلنے لگتی ہے"[۴] اس طرح افسانے میں وہ شخص مصور کو مجبور کر کے اس سے اس کا شاہکار لے گیا:

> وہ سوتے سوتے بھی اُٹھ کر اُسے دیکھتا۔ کبھی کبھی اسے وہم ہونے لگتا کہ کوئی اسے چرا نہ لے۔ وہ اس کی روح تھا، دل تھا۔۔ اور یہ خیال کہ کوئی اسے اس سے چھین نہ لے، نہایت روح فرسا تھا۔ یہ سوچ کر وہ پاگل ہونے لگتا تھا۔ پھر خود کو تسلی دیتا، "کوئی چھین کیسے سکتا ہے جب تک وہ خود کو کسی کو نہ دے دے اور وہ کیوں دے گا۔ یہ تو اس کی کل کائنات ہے" لیکن اتنی حفاظت، اتنے پہروں اور اتنی چوکیداری کے باوجود کوئی اسے لے گیا اور وہ کھڑا رہ گیا۔۔۔ بے جان سا۔۔۔[۵]

معاشرے کے یہ افراد اپنی دولت کے عوض چیزیں ہر چیز تو خرید لیتے ہیں۔ اپنی انا کی تسکین کی خاطر دو ہر اروپ تو دھار لیں گے لیکن وہ اصل مالک تو کبھی نہیں بن پائیں گے اس کی تخلیق پر ناز تو کر سکتے ہیں لیکن اپنے اندر وہ صلاحیت کبھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ہم پیسوں کے عوض چیزیں تو خرید سکتے ہیں لیکن کبھی بھی کسی کا فن اور فن سے محبت نہیں خرید سکتے۔ اسی طرح افسانے میں بہروپیے نے اس کی تخلیق دھوکے سے خرید تو لی لیکن مصور جیسی صلاحتیں کہاں سے لاتا اس لیے وہ مصور سے ہمیشہ خار کھاتا رہتا کیوں کہ وہ صرف اس کا فن پارہ ہی خرید پایا تھا:

> کچھ دنوں سے وہ خریدار کی نظروں میں بجائے تشکر کے اپنے لیے ایک چھپی ہوئی نفرت محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے اتنی انمول تخلیق حاصل تو ضرور کر لی تھی لیکن اس کا بنانے والا تو کوئی اور تھا اور یہ سچائی خریدار کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی تھی۔ وہ بے شک اس کا مالک بن گیا تھا مگر خالق تو نہیں بن سکا تھا اور یہی بات اس کے دل میں تخلیق کار کے لیے نفرت، حسد اور جلن پیدا کرتی تھی۔[۶]

اپنے مفادات کو پورا کرنے کے بعد اونچے طبقے کی نظر میں نچلے طبقے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہی صرف خواہشمند ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے ساتھ کیڑے مکوڑے کی طرح سلوک کرتے ہیں۔ اس طرح افسانے میں پہلے اس شخص نے تصویر کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا، مصور کے سامنے ایسے ظاہر کیا کہ اس سے زیادہ فن پاروں کا جویا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اس کی تصویر کو اس سے بڑھ کر کوئی قدر دان نہیں مل سکے گا۔ یہ سب اس کا دکھاوا تھا۔ جس نے بظاہر تہذیبی لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ جب کہ وہ اندر سے ایک کھوکھلا انسان تھا۔ جلد ہی اس کا گھٹیا پن ظاہر ہو گیا:

> جب سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ تخلیق کار آتے جاتے اکثر اپنی تخلیق کو دیکھ لیتا ہے تو وہ اسے کبھی کھڑکی کے پٹ کے پیچھے، کبھی پردے کے پیچھے اور کبھی کسی ایسی جگہ چھپا دیا کرتا جہاں اس پر اس کی نظر نہ پڑ سکے۔ لیکن دنیا کے سرخرو ہونے کے لیے وہ بڑی چالاکی سے کسی خاص تقریب، مہمانوں کی آمد یا دعوت وغیرہ کے موقع پر اسے خوب سجا بنا کر پیش کرتا اور دوسروں سے اس کی خوبیاں ایسے بیان کرتا جیسے وہ ہی اس کا خالق ہو۔ لوگ اس کے انتخاب کی داد دیتے اور اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔[۷]

اونچے طبقے کو جس شے سے مفاد حاصل ہو جائے تو ان کی نظر میں اس شے کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ پیسوں کے عوض اشیاء کو خریدتے ہیں۔ اس سے افادیت حاصل کر کے پھینک دیتے ہیں۔ کچھ یہی حال اس شخص نے اس تصویر کے ساتھ کیا، اپنے مفاد کی خاطر اسے استعمال کیا اور پھر جب اسے محسوس ہوا کہ یہ اس کے کسی کام کی نہیں تو اسے پھینک دیا۔ اس کے پاس پیسا تھا لیکن تخلیقی صلاحیت نہیں تھی تو اس نے پیسے کے ذریعے سے تخلیق کو خرید لیا۔ جب کہ اسے دنیا میں اس کی وجہ سے شہرت نصیب ہوئی ہر جگہ اس کی وجہ سے اس کی واہ واہ ہوئی لیکن اس نے اس کی کوئی قدر نہیں کی:

> اس کی سانس رک گئی۔ اس کا دل سائیں سائیں کرنے لگا۔ یہ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں۔ وہ قریب ہوتا گیا۔ قریب اور قریب۔۔۔ یہ کیا؟ اس کی تخلیق نہایت لاپروائی سے مٹی سے اٹی ہوئی ایک کونے میں رکھی تھی۔[۸]

اونچے طبقے کو کبھی بھی نچلے طبقے کے جذبات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ ان کے اندر بس یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر ایک چیز پر ان کا تسلط نظر آنا چاہیے انہیں کیا معلوم نچلے طبقے نے کتنی محنت سے سب حاصل کیا ہوتا ہے۔ افسانہ اونچے طبقے کی عکاسی کر رہا ہے کہ ان کے اندر اس فن کی کوئی قدر نہیں تھی۔ بس وہ چاہتا تھا فن کار کے اندر جو خداداد صلاحیتیں تھیں انھیں بھی خرید لے۔

"آخر میرا قصور۔۔!" افسانہ نچلے طبقے کے بچوں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کے بارے میں ہے۔ جو اپنے بچوں کو غربت سے مجبور ہو کر لوگوں کے گھروں میں کام کرنے کے لیے بھیجتے ہیں اور وہ وہاں ظلم و ستم کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ کہانی بھی اسی طرح کے ایک خاندان کی ہے جن کی غربت کے باعث دو وقت کی روٹی ہی پوری نہیں ہوتی۔ مرکزی کردار برکتے کا ہے جس کے آٹھ بچے تھے شوہر ایکسیڈیٹ کے باعث کام کرنے سے قاصر تھا۔ اپنے بچوں کی واحد خود کفیل تھی۔ دو وقت کی روٹی پوری نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں سب ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑتے تھے۔ ماں باپ اپنی محرومیوں کا بدلہ بچوں کو گالم گلوچ مار کٹائی سے لیتے تھے۔ آخر وہ کرتے ہی کیا بالائی ساخت کی معاشرتی تقسیم ہی کچھ اس انداز کی ہے کہ غریب طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے پاس بنیادی زندگی کے وسائل ہی نہیں، جن کے ذریعے بچوں کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ وہ صرف اپنی اجارہ داری کے بارے میں سوچتے ہیں انھیں زیریں ساخت کے مسائل سے کوئی غرض نہیں ہے۔ "چار پانچ ہزار سالہ تہذیبی تاریخ میں تشکیل پانے والے تمام سماجی، معاشی نظاموں میں عمومی طور پر رعایا اور عوام بے بس، کمزور اور محکوم اکثریت میں شمار رہی ہے۔ لیکن ان میں بھی کئی طرح کے غلاموں، بے زمین ہاریوں، کمی کمینوں، اچھوتوں، مزدوروں سمیت بہت سے ایسے انسانی طبقات یا گروہ رہے ہیں جو اپنی بے اختیاری، کمزوری اور بے حیثیتی کے باعث کسی بھی طرح کی تاریخی دستاویزات میں بھی جگہ نہیں پا سکے"۔[۹] افسانے میں جب ان کی ماں بچوں کی ضروریات نہیں پوری کر پاتی تو تنگ آ کر سوچتی:

> ساری مصیبتیں اُسے اکیلے ہی جھیلنا تھیں۔ کبھی کبھی تو اتنی عاجز ہو جاتی کہ دل میں ٹھان لیتی کہ سارے بچوں کو زہر دے کر خود بھی زہر کھا لے گی اور دنیا کے الجھیڑوں سے نچنت ہو جائے گی۔ مگر یہ بھی کوئی آسان بات نہیں تھی اور پھر جب کوئی بچہ اسے پیار سے اماں کہہ کر بلاتا تو اس کا سارا غم و غصہ کافور ہو جاتا۔[۱۰]

معاشرے کے بنیادی ستون بالائی ساخت کے تسلط میں ہیں جس کی وجہ سے زیریں ساخت کو ہمیشہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی بنیادی ضروریات زندگی ہی پوری نہیں ہو پاتیں۔ انھیں دو وقت کی روٹی ہی میسر نہیں آتی۔ وہ بڑی مشکل سے گزر بسر کرتے ہیں۔ اس طرح افسانے میں آئے دن ان کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اگر ایک وقت کچھ کھانے کو ملتا تو دوسرے وقت فاقہ کاٹنا پڑتا۔ بچے آپس میں کھانا نہ ملنے کی وجہ سے لڑائی کرتے ایک دوسرے سے چھین کر کھاتے جب ماں ان سے تنگ پڑتی تو ان پر چلاتی:

"ارے مردار۔۔۔ چپ ہو جاؤ۔۔۔ کم بختوں مجھے مار ڈالو۔۔۔ میری بوٹیاں بنا کر کھالو۔۔۔ منحوسوں کا تندور ہی نہیں بھرتا۔۔۔ کہاں سے لاؤں۔ کوٹھے پر بیٹھ جاؤں جا کر۔۔۔ اب تو وہاں بھی کچھ نہیں ملے گا۔ ان بوڑھی گلی سڑی ہڈیوں کی کون قیمت لگائے گا۔ [11]

برکتے کی اتنی مشکلات دیکھ کر اس کی دوست نازو نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کو اس کی مالکن کے گھر اس کی بچی کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ دے۔ برکتے اس کے لیے راضی نہیں تھی کیوں کہ اس کے بچپن میں اس کی ماں نے اسے کسی کے گھر ایسے ہی چھوڑا تھا۔ اسے اچانک یہ واقعہ یاد آ گیا جب اس کی ماں اسے پڑوسن کے ساتھ لے کر ان کے گھر گئی:

سب نے نرمی سے اور اچھی طرح بات کی۔ پیسے، روٹی کپڑا۔ ہفتے بھر بعد ایک چھٹی۔ سب معاملات طے ہو گئے۔۔۔ صرف کھیلنا کودنا ہی تو تھا۔ اتنے ڈھیر سارے طرح طرح کے کھلونے۔ پھر ٹی وی بھی تھا اور جب یہ سب گھومنے جائیں گے تو برکتے بھی ساتھ جائے گی۔ اس کا مطلب ہے مزہ ہی مزہ ہے۔ [12]

غربت کے باعث دو وقت کی روٹی پوری کرنا خاندان کے واحد کفیل کے لیے مشکل امر ہے۔ جس کی وجہ سے ماں باپ چند پیسوں کی خاطر اپنے جگر گوشوں کو دوسروں کے آسرے پر چھوڑنے پر مجبور ہیں۔ ان معصوم بچوں کی مجبوریوں کو چند پیسوں کے عوض خرید لیا جاتا ہے۔ وہ معلمات جو اتنے بچوں کو تعلیم کی روشنی سے آراستہ کرتی ہیں وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ان معصوم بچوں کو ملازمت پر رکھ لیتی ہیں۔ لیکن انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ علم جس کی روشنی وہ دنیا بھر میں پھیلا رہی ہیں خود ان کے گھر میں کام کرنے والے بچے اس روشنی سے محروم ہو رہے ہیں۔ بالائی ساخت کو ان بچوں پر کبھی رحم نہیں آتا۔ حمراء خلیق کہتی ہیں:

ہمارے ہاں تو بہت زیادہ طبقات کا تضاد ہے۔ ہمیں اپنے نوکروں سے تضاد ہے مجھے لفظ نوکر پسند نہیں۔ نوکر سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کوئی آپ کا کام کر رہا ہے؟ کہی آپ کام کر رہے ہیں۔ میرا بیٹا کہیں نوکر ہی تو ہے۔ آپ ہم اس کے لیے لفظ نوکر استعمال نہیں کریں گے۔۔۔۔ اپنے اللہ کے بارے میں سوچیں اس نے کیا کہا تھا؟ امیر غریب طبقے ہم نے بنائے ہیں، مذہب نے نہیں نہ۔ ہم نے ملک کا کیا حال کر دیا مسلمان مسلمان کو مار رہا ہے۔ مجھے اس سب سے تکلیف ہوتی ہے۔ ۱۳

ایسے ہی افسانے میں برکتے جس عورت کے گھر کام کرتی تھی وہ بھی ایک استانی تھی۔ شروع شروع میں برکتے کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ان کے رویے میں تبدیلی آنے لگی:

اب چھوٹے موٹے کام بھی اس کے سپرد ہوتے جا رہے تھے۔ زیادہ کھیلنے یا بہت دیر تک ٹی وی دیکھنے پر سختی ہونے لگی تھی اور پھر سب سے بڑھ کر جس دن ماسی نہ آتی تو اس سے برتن دھلوائے جاتے۔ مہمان آتے تو چائے بھی بنوائی جاتی۔ حتیٰ کہ جھاڑو پوچھے والی ماسی چھٹی کر لیتی تو پورے گھر میں جھاڑو اور پوچھا بھی کرنا پڑتا۔ دُھلے کپڑے تہہ کر کے الگ الگ الماریوں میں رکھنا تا اس کے روز کے کاموں میں شامل تھا۔ ۱۴

معاشرے کی اس دو طبقاتی تقسیم کی وجہ سے بالائی ساخت کے خیال میں دنیا میں جینے کا حق صرف ان کے پاس ہے۔ جبکہ نچلے طبقے کے پاس جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اونچا طبقہ اپنی دولت اور طاقت کے نشے میں اتنے دھت ہے کہ اپنے گھروں میں رکھے ہوئے ملازم بچوں پر بھی یہ لوگ تشدد کرتے ہیں۔ ان کے جائز حقوق سلب کر لیے جاتے ہیں۔ انھیں معمولی غلطی پر غیر معمولی سزائیں دیں جاتی ہے۔ ان کے ساتھ انسانوں والا سلوک نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی انھیں انسان تصور کیا جاتا ہے۔ اس طبقے کے بچوں کے پاس ان کی مرضی کے کام کرنے کی اجازت بالکل نہیں ہوتی۔ افسانے میں بھی اگر کبھی برکتے کا کسی کام کے نہ کرنے کا دل، یا کچھ نہ کھانے کا دل نہ ہو تو اس کے ساتھ اس کی مالکن کا سلوک برا ہے:

لو بھئی ان کے بھی دماغ ہو گئے۔ یہ دال نہیں کھائیں گی۔ سنا گھر میں روکھی سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں تھی یہاں دال سبزی کھانے سے انکار ہے انھیں گوشت اور مرغی چاہیے۔ ہماری برابری

کرنے چلی ہیں۔ بس یہی تو بات ہوتی ہے چھوٹے لوگوں کی، چار دن پیار سے رکھ لیا کہ دماغ ہی
خراب ہو گیا۔ اصل میں اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ ان سے برابری کا سلوک کیا جائے۔ انھیں
ان کی اوقات ہی میں رکھنا چاہیے۔ ۱۵؎

مالکن کے یہ جملے انتہائی معنی خیز ہیں کہ ان کے خیال میں نچلے طبقے کے پاس سوچنے کے لیے دماغ ہی نہیں ہے۔ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف صاحب اقتدار طبقے کے پاس ہے غریب لوگوں پر ظلم کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان پر بے جا رعب جھاڑنا اور ناجائز سختی کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے۔ غریب اپنی مجبوری کی بناء پر ان کے آگے جھک جاتے ہیں اور یہ ان کی مجبوریوں کو چند پیسوں کی عوض خریدتے ہیں۔ اونچے طبقے کے لوگ ہی اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ کتنا کسی سے کام کروانا ہے۔ وہ چھوٹی بچی ہے جس کے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کام کرنے کی لیکن اس کے باوجود اس کی مالکن نے ہی یہ فیصلہ کرنا ہے اس نے کتنا کام کرنا ہے اور کس نوعیت کا کرنا ہے۔ جہاں کہیں اس سے غلطی ہو گئی اس کی سزا بھی وہی طبقہ دے گا اور اس کی سزا کا تعین بھی وہ طبقہ اس کی عمر کے مطابق نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی مرضی سے کرتا ہے:

بس پھر کیا تھا۔ ان پر تو جنون طاری ہو گیا۔ پہلے تو چیخ چیخ کر انھوں نے برکتے کو جگایا۔ اس کی پیٹھ پر
دو گھونسے رسید کیے اور جو ڈانٹنا شروع کیا تو گھر سر پر اٹھا لیا۔ وہ رونے لگی تو ان کا غصہ چوگنا ہو گیا۔
"روئے گی۔۔۔ آواز نکلے گی۔ منھ بند۔" اور اسی کے ساتھ ہاتھوں سے اور جو ہاتھ میں چیز آئی
اس سے مار مار کر اسے لہولہان کر دیا۔ جتنی اس کی آواز نکلتی اتنی زور کی مار پڑتی۔ اس کا منھ سوج
گیا، ہاتھوں پر نیل پڑ گئے۔ وہ رو رو کر نیم بے ہوش ہو گئی۔ ۱۶؎

افسانے میں اس اونچے طبقے کے مظالم کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔

"ہمایوں بخت" افسانہ معاشرے کے ان افراد کی عکاسی کرتا ہے جن کا تعلق اونچے گھرانوں سے ہوتا ہے اور وہ شان و شوکت کی زندگی گزارتے ہیں، جن کے خوابوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے بڑے خواب دیکھتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک بچے کا ہے جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی جو بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور ہر ایک کی آنکھوں کا تارا تھا۔ جسے دیکھ کر سب جیتے تھے:

میرا جس قدر بھی لاڈ ہوتا، کم تھا۔ میرے ماں باپ میری ہر بات مانتے تھے اور ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ پیسے کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ جو بات منھ سے نکلتی پوری ہو جاتی۔ امی کی صحت کی خرابی کی وجہ سے میرے لیے آیا رکھ دی گئی تھی۔ ننھیال ددھیال سب میں میرے لاڈ چونچلے ہوتے تھے۔[۱۷]

بالائی ساخت سے تعلق رکھنے والے طبقے کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح کے خواب دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے۔ کیوں کے وہی اس معاشرے کے علم بردار ہیں۔ معاشرے کی اقدار انہی کے ہاتھ میں ہیں، وہ جو چاہیں جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ انھیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات کا تعین کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کے لیے آزادی سے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی دسترس میں ہر چیز ہوتی ہے، وہ اپنے بچوں کی خواہشات پوری کر سکتے ہیں۔ ان کے خوابوں کے لیے پیسا ہوتا ہے جس کے ذریعہ ان کی تکمیل ہوتی ہے۔ افسانے میں ہمایوں بخت کے ماں باپ کے خواب بھی بڑے بڑے تھے۔:

میرے مستقبل کے کیا کیا منصوبے بنائے جاتے تھے۔ امی مجھے ڈاکٹر دیکھنا چاہتی تھیں تو ابو انجینئر، کبھی پائلٹ بنایا جاتا تھا تو کبھی بڑا فوجی افسر۔ گھنٹوں میری ماں اس بات پر غور کرتی رہتی کہ مجھے بیرونِ ملک پڑھنے کب بھیجا جائے۔ میں ابھی چھ سال ہی کا تھا لیکن خواب کتنے اونچے اونچے دیکھے جانے لگے تھے۔[۱۸]

جب اس طبقے کے حالات پلٹا کھاتے ہیں تو وہ سارے خواب جو انہوں نے اپنے مستقبل کے لیے دیکھے ہوتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے ان کا انداز زندگی بدل جاتا ہے کیوں کہ وہ مصائب و مشکلات کے عادی نہیں ہوتے۔ اس لیے انہیں مشکل حالات میں زندگی گزرانا ناممکن لگتا ہے۔ اس طبقے کو نچلے طبقے کی مشکلات اس وقت سمجھ آتی ہیں جب خود ان سے گزرنا پڑے۔ "پریم چند کی نظر میں اعلیٰ طبقہ اور نچلا طبقہ دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہیں ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ زمیندار جو استحصال کرتا ہے اور کسان جو محنت کرتا ہے اور استحصال سہتا ہے۔[۱۹] افسانے میں جب اس کے باپ کی ملازمت غلط الزام کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے انھیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی پوری دنیا اجڑ گئی ہو۔ ان کی مشکلات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا:

ہمارے گھر پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ابو نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن کچھ نہ بنا۔ جمع شدہ پیسا رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ امی یہ غم نہ سہہ سکیں اور بالکل ہی پلنگ سے لگ گئیں۔ اِدھر ابو نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے، اُدھر امی کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی اور آخر ایک دن وہ چپکے سے رخصت ہو گئیں۔ ۲۰

اس طبقے کو بھی غربت میں انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کا سامنا نچلے طبقے کو ہوتا ہے۔ ان کی اپنی بنائی گئی اقدار انہی پر حاوی ہو جاتی ہیں جس کے باعث ان کا گزر بسر مشکل ہو جاتا ہے۔ افسانے میں ان کے حالات بدلنے کی دیر تھی ہر رشتہ بدل گیا۔ اس کا باپ گم ہونے کے ساتھ ہی اس کی مشکلات اور بڑھ گئیں۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد جب اسے مختلف کام کرنے پڑے تو اس کے مسائل بڑھتے چلے گئے۔ اونچے طبقے کے بچوں کی زندگیاں جتنی شاہانہ گزری ہوتی ہیں وہ کیسے مشکل حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ وہ ان رویوں کے عادی نہیں ہوتے جو اونچا طبقہ کا اپنے نوکروں کے ساتھ کرتا ہے:

مجھے کچھ کرنا نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ ہو سکتا ہے، کوئی مہربان میری پڑھائی میں مدد کر دے۔ چنانچہ کچھ دن کوشش اور بھاگ دوڑ کے بعد میں ایک گھر میں ملازم ہو گیا۔ لیکن مجھے کوئی کام نہ آنے کی وجہ ہر گھڑی ڈانٹ پڑتی تھی۔ میرے مالکوں کا لہجہ نہایت تلخ اور تحکمانہ ہوتا تھا۔ ۲۱

کبھی بھی اونچا طبقہ نچلے طبقے کو اپنے برابر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ کیسے ان کے مد مقابل آسکتے ہیں۔ وہ ان کے درمیان برابری کا سلوک نہیں رکھتے۔ جس طرح ان کے بچوں کا رہن سہن، قیمتی اوڑھنا پہنا ہوتا ہے، ان چیزوں کے لیے نچلے طبقے کے بچے ترستے رہتے ہیں۔ معاشرے کے اندر وسائل کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے معاشرہ دو طبقات میں بٹا رہتا ہے اور احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔ نچلے طبقے کے اندر کبھی ہمت نہیں پیدا ہوتی کہ وہ مقابلہ کر سکیں۔ افسانے میں جب وہ حالات سے تنگ آ کر کسی کے گھر میں کام کرنا شروع کرتا ہے تو ان لوگوں کا اس کے ساتھ رویہ بہت برا ہوتا ہے وہ اس کے ساتھ غلاموں کی طرح سلوک کرتے ہیں:

میں نے سوچا کہ اگر ان سب باتوں کے باوجود یہاں مجھے کوئی پڑھا دیا کرے تو میں یہ سب بھی برداشت کر لوں گا۔ مگر میں نے یہ بات کہی تو سب نے میرا خوب مذاق اڑایا۔ میں اگر ان کے

بچوں کے کھلونے اور خوب صورت کتابوں کو اٹھا کر دیکھنے لگتا تو مجھے جھڑکیاں پڑتیں۔ بچے ماں
باپ سے شکایت کرتے اور مجھے ڈانٹتے۔ میری ذہنی کیفیت عجیب ہوتی جارہی تھی۔ ۲۲

ہمایوں بخت نے اتنی مشکلات دیکھیں، امیری سے غریبی تک کا سفر کاٹا چھوٹی عمر میں مسائل کا سامنا رہا۔ "ہمایوں بخت "افسانہ معاشرے کی اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ بالائی ساخت سے تعلق رکھنے والے لوگ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اپنے ماتحتوں کو تعلیم سے نا آشنا رکھنا چاہتے ہیں دراصل وہ نچلے طبقے کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو تعلیم کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے مسائل سے بھرا پڑا ہے۔ اظہار حیدر ہمایوں بخت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ہمایوں بخت کی طرح نہ جانے کتنے ہونہار لڑکے معاشرے میں دربدر ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور
قابل ذکر ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نویسوں نے اس المیے کو قابل اشاعت نہیں سمجھا۔ ایسے
ادیب قومی درد اور انسانی تقاضوں سے کتنے نا آشنا ہیں، اس کا احساس شاید بہت کم لوگوں کو ہے۔
یہ فریضہ صرف اُن فن کاروں نے ادا کیا ہے، جنھوں نے شاعری یا افسانہ لکھنا سیکھا نہیں ہے، بلکہ
پیدائشی یا خداداد صلاحیت رکھنے کی بنیاد پر فن کار ہیں۔ ۲۳

اس طبقے کے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے ان کی مشکلات اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے ایسے حالات میں زندگی گزاری ہوتی ہے جس کے برعکس زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔

"دیکھ کبیر ارویا" افسانہ بالائی ساخت کی ترجمانی کرتا ہے۔ افسانے کے اندر سربراہی ہسپتال والوں کے پاس ہے وہ ہر ایک کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کرتے ہیں۔ انھیں ایسا لگتا ہے کہ صرف انہی کے پاس حق ہے، سارے اصول و ضوابط صرف وہی بنا سکتے ہیں۔ وہاں کام کرنے والوں کی زندگیوں کو اپنی مرضی کے طابع رکھنے کے عادی ہیں۔ انھیں کسی سے کوئی مطلب نہیں ہوتا، نچلا طبقہ جتنا مرضی کام کرلے جتنی مرضی محنت کرلے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ مزدور کی حیثیت معمولی ہی رہتی ہے۔ دیکھا جائے تو افسانے میں جامو کا کردار ہسپتال میں اسٹریچر بردار کا کردار تھا۔ وہ دن بھر کام کرتا، ہر ایک کی مدد کرتا، کسی کو بھی کسی کام کی ضرورت ہوتی تو اس کو مدد کے لیے بلواتے تھے۔ وہ ہر ایک کا شریک غم تھا۔ اگر کسی کا کوئی مرجاتا تو وہ بھی انہی کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر روتا:

کسی زخمی کو طبی امداد پہنچنے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ انسانی جان کا سوال ہے۔ ذرا سی کوتاہی سے کچھ کا کچھ ہو سکتا ہے۔ کوئی کسی کا باپ ہے تو کوئی ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک، کوئی کسی کا سہاگ ہے اور کوئی کسی خاندان کا رکھوالا، خدایا سب کو صحت دینا، سب کو زندگی دینا۔ جامو کی دن کی ڈیوٹی ہوتی یا رات کی وہ یہ کبھی نہیں سوچتا تھا۔ وہ ہر موقعے پر حاضر رہتا تھا۔ ۲۴

جامو ایک رحم دل انسان تھا جس کے دل میں ہر ایک کے لیے ہمدردی تھی جو ہر ایک کا خیال کرتا تھا، بدلے میں اس کے ساتھ اچھا رویہ روا نہیں رکھا گیا۔ سب اس کا مذاق اڑاتے تھے اس کی اچھائی کو اس کی بے وقوفی تصور کیا جاتا تھا۔ اونچا طبقہ ہمیشہ نچلے طبقے کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے۔ ان کے اندر بے حسی رچ بس چکی ہے، انسان کو انسان سمجھنے کے روادار نہیں ہیں۔ ان کا یہ رویہ اس ڈر کی پیداوار ہے کہ کہیں یہ ان سے آگے نہ نکل جائیں یا وہ ان کی برابری نہ کرنے لگیں۔ افسانے میں انتظامیہ کا رویہ مریضوں کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے جامو کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔

ان سب کے لیے تو یہ ایک معمول تھا، کسی کی چوٹ، کسی کا زخم، کسی کی دل ہلا دینے والی چیخیں، ان سب پر کچھ اثر نہیں کرتی تھیں۔ وہ تو اسٹریچر پر پڑے ہوئے مریض کو ایسے گھسیٹتے ہوئے لاتے لے جاتے تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بے جان چیز ہے۔ آپریشن تھیٹر سے نکلے ہوئے مریض سے جس کے تازہ تازہ ٹانکے لگے ہوئے ہوتے یہ سب ایسے کھینچ تان کرتے کہ جامو کا دل حلق میں آجاتا۔ ۲۵

اس دنیا میں انسانیت بے حسی کی ہر حد پار کر چکی ہے۔ ہر کوئی اپنی ذاتی زندگی میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں کی پرواہ نہیں۔ مصروف ہیں۔ ان کی اپنی دنیا ہے جس میں نچلے طبقے کی کوئی گنجائش نہیں وہ اپنے کاموں میں مگن ہیں۔ اپنے رویوں میں ایسی سختی پیدا کر لیتے جس میں انھیں نچلے طبقے کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ان کی نظر میں ان کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کی نہیں ہے۔ افسانے میں جامو اور اس جیسے جھگیوں میں آباد لوگوں کی ایک پوری دنیا ہسپتال کے قریب آباد تھی جس میں ان کا دکھ درد سب اس چھوٹی سی دنیا کے اندر تھا۔ لیکن ان بڑے لوگوں کو اس کی کوئی خبر نہ تھی:

ہسپتال کے داہنی طرف بہتے ہوئے نالے پر کئی جھگیاں تھیں اور کسی پرانی شکستہ بدحال کوٹھی کے
کھپریل چھتوں والے اوپر تلے بنے ہوئے کئی سرونٹ کوارٹرز جن کی نہ چھتیں سلامت تھیں اور
نہ لکڑی کے جھولتے ہوئے زینے۔ نہ چھجے اور نہ کھڑکیاں۔۲۶

نچلا طبقہ اپنے مسائل کے باوجود اپنے غموں کو بھلا کر اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو تلاش کرتا ہے اور ان سے محظوظ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی دنیا بھی اونچے طبقے کے ساتھ ہی آباد ہوتی ہے، لیکن انھیں خبر نہیں ہوتی۔ خوشی کا تعلق انسان کی ذہنی کیفیت ہوتا ہے۔ جب تک وہ اندر سے سکون میں ہیں ان کی خوشیاں عروج پر ہیں۔ یہ خود بھی ان کو اپنی خوشیوں میں شامل نہیں کرنا چاہتے کیوں کے انھیں اپنی حیثیت کا انداز ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں کچھ بھی نہیں۔ جاموشادی کے بعد بہت خوش تھا اس کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی تھی جس میں خوشیاں ہی خوشیاں تھی۔ اس کی ایک محبت کرنے والی بیوی جو دن رات اس کا خیال رکھتی تھی اور اس کی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ جاموکے لیے یہ سب نیا تجربہ تھا اور وہ اس سب سے بہت خوش تھا۔

رات کو تھکے ہارے جب دونوں موٹے موٹے بانوں کے پلنگوں پر لیٹتے اور جھونپڑی کے سامنے
بہتے ہوئے گندے نالے کی بدبو غفور کے گھوڑے کی لید کی باس اور پھر اس کے ساتھ نانبائی کے
تندور میں لگتی ہوئی گرم گرم تازہ تازہ روٹیوں کی اشتہا انگیز خوش بو ماحول پر پھیل جاتی تو وہ
دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور یہ بو انھیں مشک و عنبر سے زیادہ مسحور کن محسوس
ہوتی، ان کی آنکھوں میں محبت اور مسکراہٹ میں مٹھاس ہوتی۔۲۷

جب جاموکو باپ بننے کی خوشی ملی تو وہ بہت خوش تھا۔ جیسے اُسے کسی نے زمین سے آسمان پر بیٹھا دیا تھا۔ اولاد کی خوشی ہی ایسی ہوتی ہے جس میں انسان سب غم بھول جاتا ہے۔ جاموکے پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اُسے دنیا جہاں کی دولت نصیب ہوگئی تھی۔ وہ پہلے بھی اپنی بیوی کا بہت خیال رکھتا تھا لیکن اب تو اس کا ہر طرح کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے گل جان کا نام شروع دن سے ہسپتال میں لکھوا دیا تھا۔ اس کا خواب تھا کہ اس کا بچہ بھی کسی بڑے ہسپتال میں پیدا ہو۔ خواب تو سب دیکھ سکتے ہیں، چاہیے امیر ہو یا غریب لیکن نچلا طبقہ اپنے خوابوں میں کیسے اونچے طبقے کی ساتھ برابری کر سکتا ہے اس کی اجازت دو طبقوں میں بٹا ہوا معاشرہ کبھی نہیں دیتا:

بھابی کا ہے کو پریشان ہوتی ہو، میں اس ہسپتال میں چھ سال سے ملازم ہوں، سب بڑے ڈاکٹر ڈاکٹرنیاں مجھے جانتی ہیں، آدھی رات کو بھی جاؤں گا تو انکار نہیں کرے گا کوئی۔ "تو کہتا ہے بھیا، لیکن مجھے تو ان بڑے ڈاکٹروں کا کوئی اعتبار نہیں، اللہ جانے وخت پر کیا دماغ دکھانے لگیں اور پھر ان کی اتنی بڑی بڑی فیس کیسے بھرے گا۔ "واہ بھابی میں وہیں کا نوکر ہوں، مجھے کیا دماغ دکھائیں گے۔ " آخر میں نے بھی رات دن ان کی خدمت کی ہے، بھابی میرا بچہ اسی بڑے ہسپتال میں پیدا ہو گا دیکھنا تم۔۲۸

اونچا طبقہ نچلے طبقے کے جذبات و احساسات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، اُس کی نظر میں ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں ارمانوں کی کوئی اہمیت نہیں، وہ انھیں کچل کر رکھ دیتے ہیں ان کی نظر میں پیسے اور پیسوں والوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ احکام بالا کی اس وقت انسانیت کی موت واقع ہوتی ہے جب پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے مریض تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے اور احکام بالا کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ اونچا طبقہ اختیارات رکھنے کی وجہ سے ہر چیز کا تعین خود کرتا ہے یہاں تک کہ انسانوں کی زندگیوں کا بھی اختیار اس کے پاس ہے۔ جس رات گل جان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو جامو ہسپتال میں تھا۔ جب گل جان کو ہسپتال میں اس کے محلے والے لے کر آئے تب جتنے بھی ڈاکٹر ڈیوٹی پر تھے وہ مسز عظیم کے ایمرجنسی آپریشن کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس وقت کون جامو کہاں کا جامو کسی کو کوئی ہوش نہ تھا ان کے لیے سب سے اہم مسز عظیم کو بچانا تھا۔ وہ چیختا چلاتا رہا۔ اس کی بیوی مر جائے گی کوئی اُسے دیکھ لے کوئی تو ہو لیکن کسی نے اس کی نہ سنی انسانیت کی دھجیاں اڑادی گئیں:

مبارک ہو مسٹر عظیم زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں "جامو تم جاسکتے ہو" وہ سب گھر آگئے اور اب وہ کئی گھنٹوں سے مسلسل گل جان کو دیکھ رہا تھا جو زرد اور سرخ چھینٹ کے ملگجے کپڑوں میں اب بھی کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ "گل جان تو جیت گئی، تو نے بیٹا پیدا کر دیا۔ میں ہار گیا، میری گل جان، میری نور جہاں، میری ملکہ سب کچھ ختم ہو گیا، کوئی کسی کا باپ ہے، کوئی کسی ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک، کوئی کسی کا سہاگ۔ "وہ ہسپتال میں داخل ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا۔۲۹

اس دنیا کی بے حسی اس کی بیوی برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ معاشرے کی اتنی بے حسی جس میں انسان کی جان تک کی کوئی پروا نہیں۔ حمرا خلیق نے معاشرے کی بے حسی کی واضح تصویر اس افسانے میں پیش کی۔

"سو روپے کا دوپٹہ" افسانے میں معاشرے کے دونوں طبقات کی واضح عکاسی کرتا ہے۔ زیریں ساخت معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو پوری زندگی محنت و مشقت کرتا رہتا ہے، جن کی زندگیاں صرف دو وقت کی روٹی کے لیے ہر ایک کے آگے ذلیل ہوتی ہیں اور ان کو ان کی محنت کا معاوضہ چند روپوں کی صورت میں ملتا ہے۔ زیریں ساخت پوری زندگی بالائی ساخت کی غلامی میں گزارتی ہے۔ بالائی ساخت ان کو کام دینے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں تک کی مالک بن جاتی ہے۔ سو روپے کا دوپٹہ افسانہ بھی ایک ایسی عورت کے متعلق ہے جس کا تعلق معاشرے کی زیریں ساخت سے تھا۔ رضیہ پندرہ سال سے لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پوچے اور کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی۔ وہ بہت خوددار عورت تھی اس کی گھر سے نکلنے اور لوگوں کے گھروں میں کام کرنے کی بڑی وجہ اس کے شوہر کا دنیا سے چلے جانا تھا۔ وہ واحد کفیل تھا جبکہ رضیہ کے لیے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا مشکل کام تھا:

> جس دن وہ پہلی مرتبہ گھر سے نکلی، اس کے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔ وہ تو کبھی اکیلی گھر سے باہر گئی ہی نہیں تھی اور پھر یہ بھی کہ وہ کسی نئے گھر میں جا کر کس طرح نوکری کی بات کرے گی، کیا بات کرے گی؟ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور جسم پسینے سے شرابور۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھیک کا کشکول لے کر سڑک پر آ گئی ہے۔[۳۰]

بالائی ساخت سے تعلق رکھنے والا طبقہ زیریں ساخت کو ہمیشہ اپنا ماتحت سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ سلوک بھی غلاموں کی طرح کیا جاتا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی اتنی بڑی سزا دی جاتی ہے، جسے وہ عمر بھر یاد رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ جانوروں سے بڑھ کر سلوک کیا جاتا ہے ان کی حیثیت ان کی نظر میں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کی نہیں ہے۔ ان کے لیے اصول واضح ہوتے ہیں، جن کی خلاف ورزی پر انھیں سزا دی جاتی ہے۔ ان کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے، کبھی ان کے ساتھ زبانی اور جسمانی بد سلوکی کی جاتی ہے، کبھی جبری طور پر زائد وقت کے لیے کام کروایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی بیماری تک کی چھٹی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ ان کی زندگیاں ان کے پاس گروی پڑی ہوتی ہیں وہ جیسے چاہتے ہیں انھیں کیش کرواتے ہیں۔ اس طرح کے اصولوں کی وجہ سے معاشرہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ محمد حسن لکھتے ہیں۔

یہ عصری حسیت سماجی استحصال کے اسی جبر سے تڑپتیں ہوئی حسیت ہے جو اپنی تکمیل کے
لیے مضطرب ہے۔ اس اضطراب نے ہمارے سماج اور اس کی اقدار ہی کو نہیں ہماری شخصیتوں کو
ہمارے اندرون کو، ہماری ذاتی زندگی کو پارہ پارہ کر دیا۔ ۳۱

رضیہ نے ان دونوں گھروں میں سالوں کام کیا اور وہ لوگ بھی اب اس کے عادی ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی جوانی سے بڑھاپا ان گھروں کی خدمت میں گزارا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ ایک اور گھر میں کام کر رہی تھی جس کی ماسی کہیں چلی گی تھی۔ اچانک رضیہ غائب ہو گئی کسی کو کوئی خبر نہیں ہوئی وہ کہاں گی:

کچھ دن گزر گئے۔ پھر ایک دن رضیہ نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی
رہ گیئں۔ لگتا تھا برسوں کی بیمار ہے۔ کیا ہوا رضیہ؟۔۔۔۔ "بی بی! کیا بتاؤں۔ میں تو ختم ہو گئی۔
زندگی میں، میں نے اتنے غم اور دکھ دیکھے، فاقے کیے، بیماریاں اٹھائیں لیکن اتنا برا کبھی نہیں ہوا
میرے ساتھ۔" اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ۳۲

صاحب اقتدار طبقہ جن کے گھر وہ کام کرتی تھی وہ صرف اس کی ماہانہ تنخواہ کے مالک نہیں تھے، بلکہ وہ اس کی عزت نفس، اس کی غیرت، اس کے باقی جتنے بھی جذبات واحساسات ہیں ان سب کے وہ مالک بنے بیٹھے ہیں۔ اس لیے وہ ایک معمولی سی بات پر اس پر الزام لگا دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں اسے حوالے پولیس کے کرنے کی دھمکی دی جاتی۔ صاحب اقتدار طبقے کے اختیارات اس حد تک تجاوز کر جاتے ہیں کہ وہ اگلے بندے کی عزت نفس اور اس کی خوداری کو بھی پامال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ رضیہ کی غیرت کا جنازہ نکال کر خود کو سرخرو کرنا چاہتے تھے جیسے ہم نے مجرم ڈھونڈ لیا ہے۔ اس لیے بغیر تحقیق کے وہ اس پر الزام لگا دیتے ہیں۔ یہاں پر المیہ یہ ہے کے ہمارے معاشرے کے اندر بجائے اس کہ جو مجرم ہے اس کو قانون کے اداروں کے حوالے کیا جائے اور وہ اس کی سزا منتخب کرے صاحب طاقت طبقہ خود عدالت لگا لیتا ہے۔ صاحب اقتدار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس یہ حق ہے، کہ وہ غریب طبقے کی زندگی کا ہر فیصلہ کر سکتے ہیں خواہ ضروریات کے حوالے سے ہو یا ان کی زندگی کا کوئی اور پہلو ہو۔ وہ زندگی کے ہر معاملے کا اختیار اپنے پاس رکھتے ہیں اور پھر ان کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ جب وہ اس کو بغیر کسی تحقیق کے پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں، تو یہ اس طبقے پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ کیا وہ صرف اس کی ماہانہ اجرت کے مالک ہیں یا اس کی عزت و غیرت کے مالک بھی ہیں جو اس کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔

اگلے دن پتہ چلا وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی اس دنیا سے جس نے اس کی محنت کا مول فقط سو
روپے لگایا اور وہ انھیں حوالہ پولیس کرنے کی دھمکی بھی نہ دے سکی۔ ۳۳

دونوں طبقات کی جو کشمکش ہے یا جو جنگ ہے یہاں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے، جب وہ ان کے ان اختیارات کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی جان کی بازی ہار جاتی ہے، صاحب اقتدار طبقہ جیت جاتا ہے اور ان کی جھوٹی انا کو تسکین ملتی ہے۔ اس کی موت معاشرے پر سوالیہ نشان چھوڑ جاتی ہے۔

"مژگاں تو کھول" افسانہ معاشرے کے دونوں طبقات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس معاشرے میں جس چیز کی اہمیت ہے وہ مادیت ہے۔ جس کے پاس دولت ہے وہ طاقت ور ہے اور باقی سب اس کی غلامی کریں گے۔ مادہ ہی کائنات کی اصل حقیقت ہے، جس کے بل بوتے پر انسان دنیا میں کامیاب ہے اور لوگ اس کی غلامی کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مادہ کی بدولت ہی وہ شاہانہ زندگیاں گزار رہے ہیں۔ مژگاں تو کھول افسانہ اونچے طبقے کے رہن سہن ان کے زندگی گزرنے کے انداز کی ترجمانی کرتا ہے کہ کس طرح وہ شاہانہ زندگی گزار رہے ہیں:

علاقہ بھی کلفٹن کا تھا اور فلیٹس بھی خاصے شاندار تھے تو ظاہر ہے رہنے والے بھی صاحب حیثیت
ہی ہوں گے جن کے پاس زیادہ تر بڑی گاڑیاں تھیں اور بعض کے پاس تو ایک سے زیادہ بھی
تھیں۔ لگتا تھا تقریباً سب کے پاس شوفر ڈریون گاڑیاں تھیں۔ جس میں سے کچھ کے پاس ذاتی
ڈرائیور تھے اور کچھ کے پاس اچھے عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے دفتروں سے ملے ہوئے
ڈرائیور اور گاڑیاں۔ ۳۴

صاحب اقتدار طبقے کا طرز زندگی بہت شاہانہ ہے، وہ ایک دوسرے کے آگے احساس برتری پیدا کرنے کے لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مہنگی سے مہنگی گاڑی مہنگے سے مہنگا گھر خریدتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اپنی حیثیت سے تجاوز کر جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے یہ سب پیسے سے ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ معاشرے میں اصل اہمیت پیسے کی ہے اور ہر کوئی پیسے کا ہی پجاری ہے۔ افسانے میں ہر فلیٹ والوں کے پاس ایک سے ایک بڑھ کر گاڑی تھی۔:

کوئی سوک تھی تو کوئی نسان، کسی کی لانسر تھی تو کسی کی ٹویوٹا، تو کوئی مرسیڈیز۔ غرض ایک سے
ایک نئی اور شان دار گاڑی۔ کون کہتا ہے کہ ہمارا ملک غریب ہے۔ صرف اس پلازہ کو دیکھنے سے
ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ۳۵

معاشرے کی تقسیم کی بدولت انسان مادیت پرست ہو گیا ہے۔ مال و دولت تو انسانی ضروریات کو پورا کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ لیکن مادیت پرستی انسانیت کے خلاف ہے۔ مادیت پرستی میں انسان ڈوب کر ایسے ایسے کام کر جاتا ہے جو انسانی اخلاق و کردار اور سماج کو متاثر کرتے ہیں۔ سارے ڈرائیور صبح صبح اپنی ڈیوٹی پر آتے تھے اور سب کی آپس میں دوستی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے مالکوں کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی پورا دن کی ڈیوٹی تھی کہ کبھی مالک کے ساتھ، کبھی اُس کی بیوی اور بچوں کے ساتھ اُن کو لانے لے جانے کا کام کرتے تھے۔ ان کے آقاؤں کو ان کی کوئی پروانہ نہیں تھی وہ خود بھی تو اپنی کمیوں کو محسوس کرنے کے بجائے مادیت پرستی کے پیچھے بھاگتے ہیں:

ان ڈرائیوروں کو اپنی گاڑیوں سے ایسی محبت تھی جیسے اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ ان کے تیل پانی کا
خیال، ان کی صفائی کا خیال۔ رات کو وہ اپنی ڈیوٹی ختم کرتے تو گاڑی صاف کر کے اس پر کور
چڑھاتے اور تھکے ماندے قدموں سے اپنے گھر کے لیے نکلتے اور بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر
گھنٹوں بسوں کا انتظار کرتے۔ ۳۶

اس مادیت پرست معاشرے میں کسی کو ان ڈرائیوروں کی حالت پر رحم نہیں آتا تھا۔ کسی کو ان کی دن رات کی محنت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ دیورادن اپنے مالکوں کی خدمت کرتے تھے اور خود بسوں میں گھنٹوں دھکے کھاتے تھے۔ کسی کو کوئی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے آتے تھے اور کہاں جاتے تھے اور کس طرح جاتے تھے۔ کچھ عرصے بعد پلازا کے فلیٹ میں کچھ نئے لوگ آکر رہنے لگے۔ وہ باقی لوگوں کی نسبت اتنے صاحب حیثیت نہیں تھے۔ وہ رکشہ ٹیکسی پر سفر کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے بھی ایک چھوٹی گاڑی خرید لی۔ مادیت پرستی کے اس دور نے انسان کے اخلاق کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ مادیت کی بنا پر ایک دوسرے کو نیچا دکھانا ایک دوسرے کو کم تر سمجھنا ان کی گاڑی چھوٹی ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت کا ثبوت دیتی تھی:

پلازا کی ان شان دار گاڑیوں اور ان کے مغرور ڈرائیوروں کے درمیان یہ چھوٹی سی خستہ حال بغیر
ڈرائیور کی گاڑی نہایت بے چارگی کی حالت میں کھڑی نظر آتی تھی۔ ۳۷

جس کے پاس سرمایہ ہو گا وہ باقیوں کی نسبت برتر سمجھا جائے گا کیوں کہ اس کی قدر باقیوں سے زیادہ ہے۔ اگرچہ ڈرائیور گاڑیوں کے مالک نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ وہ سارا دن ان کے استعمال میں ہوتی ہیں اور وہ گاڑیوں کو چلاتے ہیں تو اس لیے حساس تفاخر خود بہ خود ان کے اندر آجاتا ہے۔ ان کو یوں لگتا ہے جیسے وہ خود گاڑیوں کے مالک ہیں۔ یہ دولت کی تقسیم یا مادہ کی موجودگی انسانی ذہن پر براہ رست اثر انداز ہوتی ہے۔ خاص طور پر ہمارے معاشرے کی جو ذہنیت بن چکی ہے اس میں مادیت ہماری سوچ و فکر کو بہت متاثر کر رہی ہے۔ بجائے اس کے ہم اپنی سوچ و فکر سے مادیت کو متاثر کریں اس کے بجائے مادہ ہماری سوچ و فکر کو متاثر کر رہا ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات[۳۸]

ان مادی اشیاء نے ان ڈرائیوں کی ذہنیت ہ کو اس حد تک بدل کر رکھ دیا ہے کہ وہ مالک نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ان کا مالک سمجھتے ہیں۔ ایک جو چھوٹی گاڑی کا مالک ہے اُس کے اوپر تنقیدی جملے کستے ہیں اس کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں:

> اتنا عرصہ گزرنے کی وجہ سے دوسرے ڈرائیور اکثر اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتے بلکہ بات چیت تو کیا اس کی گاڑی کا مذاق اڑاتے اور جملے کستے۔ "لو بھئی وہ گدھا گاڑی کا ڈرائیور آگیا۔" "ارے بھئی اس کے صاحب نے کیا 'شیر شاہ' سے جا کر خریدی تھی گاڑی۔" "نہیں بھئی کباڑیے سے مختلف گاڑیوں کے ٹکڑے کر کے گاڑی بنالی۔" "یار تم اپنے صاحب کو مشورہ کیوں نہیں دیتے کہ اب اس کھٹارے کی جان چھوڑ دیں۔" "کوئی ٹین ڈبے والا بھی نہیں لے گا اب تو اسے۔"[۳۹]

اس مادیت پرست معاشرے میں اخلاق و کردار کا گراف دن بدن نیچے گر رہا ہے۔ کیوں کہ ہم اخلاقیات کی نسبت مادی تعلیم پر زور دے رہے ہیں، جس کی بدولت غریب کا استحصال کیا جاتا ہے، اس کو پوری مزدوری نہیں دی جاتی۔ انسان کو انسان ہی تصور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو تکلیف پہنچانے میں فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ ان کے جذبات و احساسات کو کچل کر سکون ملتا ہے۔ وہ اپنا سکون و اطمینان، مال و دولت کے ڈھیر اکٹھے کرنے اور دوسروں کو اذیت دینے میں سمجھتے ہیں:

کچھ دنوں سے ڈرائیوروں کی تضحیک آمیز باتیں، طعنے اور گاڑی کا مذاق اڑانا اسے بہت کھلنے لگا تھا۔
وہ صبح آتا تو کوشش کرتا کہ ان لوگوں سے نظریں نہ ملائے کیوں کہ ان کی آنکھوں سے عجیب
حقارت جھلک رہی ہوتی۔ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ اور چہرے پر معنی خیزیت۔ ۴۰

یہ بالائی اور زیریں طبقے کی جنگ ہے جس میں کسی بھی چیز کی موجودگی یا کسی سرمایہ کی موجودگی چاہے وہ وقتی طور پر ہی ہو۔ وہ سرمایہ ہے یا مادی خزانہ جو بھی کسی کے پاس ہو تو وہ اس کی سوچ و فکر کو اس بدل کر رکھ دیتا ہے۔ جس سے وہ خود دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بننا شروع ہو جاتا ہے۔

"کچوری والا" افسانہ بالائی اور زیریں طبقات کے آپس میں اختلافات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک کچوری بیچنے والے کی ہے جس کا خواب ہوتا ہے اس کی بچیاں پڑھ لکھ جائیں، پھر اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ وہ کیسے امیروں کے بچوں کی برابری کریں گے، کیا یہ معاشرہ انھیں اجازت دے گا؟ کیا کبھی زیریں ساخت اپنا مقام بالائی ساخت کے اندر بنا سکے گی؟:

اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی صفیہ اور چھوٹی رضیہ۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئیں تو انھوں نے اسکول میں
پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا، کیا میں اس قابل ہوں کہ بچیوں کو اسکول میں پڑھا
سکوں؟ کیا ایک کچوری کا ٹھیلا لگانے والے کی بیٹیوں کو اسکول میں پڑھنے کا حق مل سکتا ہے؟ کیا وہ
دوسری امیر کبیر گھروں کی بچیوں کے درمیان اپنی جگہ بنا سکیں گی۔ ۴۱

غریب کے بچوں کے لیے تو معاشرے میں بہتر تعلیمی مواقع میسر نہیں۔ ان کی رسائی تو سرکاری یا نچلے درجے کے نجی سکولوں تک بھی نہیں ہو پاتی تو وہ صرف بڑے پرائیوٹ سکولوں کے خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ جب ان کے بچوں کو دو وقت کی روٹی ہی میسر نہیں تو وہ سکول جانے کے خواب کیا دیکھیں گے۔ نچلا طبقہ احساس کمتری کا شکار رہتا ہے، اسے لگتا ہے اس کا بچہ کبھی وہ مقام معاشرے میں نہیں حاصل کر سکتا جس جو اونچے طبقے کے بچوں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ ساری زندگی اس احساس کے ساتھ گزار دیتا ہے، کہ معاشرے میں اس کے حقوق کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جس میں کبھی حقدار کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا "پیداواری قوت میں اضافے کے باوجود اُجرتیں کم سے کم دینے کا رجحان کیوں پایا جاتا ہے جو ننگ و افلاس کے سوا کچھ نہیں دے گا" ۴۲ اس کے باپ کو دل میں ڈر سا لگا رہتا تھا:

اس کے دل کو چوٹ سی لگی۔ واقعی اس نے غلطی کی تھی۔ اس جیسے مزدور کم حیثیت اور ازل سے جاہل گنوار انسانوں کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اتنے بڑے بڑے اسکولوں میں پڑھانے کے بارے میں سوچیں۔ یہ ادارے تو اعلیٰ طبقے اور پیسے والے لوگوں کے بچوں کے لیے بنائے گئے ہیں، لیکن کیا یہ سرکاری اسکولز بھی ایک غریب شخص کی اولاد کو اس بات کا حق نہیں دے سکتے کہ وہ بھی تعلیم حاصل کر سکے، اور اپنی غربت اور جہالت کی زندگی سے نکل کر ایک بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔ ۴۳

ہمارا معاشرہ دو طبقات میں بٹا ہوا ہے جس میں ہر ایک کے ساتھ مساوی سلوک نہ رکھنے کی وجہ سے طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہے۔ نچلا طبقہ خود کو کم تر سمجھتا ہے جبکہ اونچا طبقہ اسے اس بات کا احساس بھی دلاتا ہے، تاکہ وہ خود کو ہمارے مدمقابل نہ سمجھ کر مقابلے کی جنگ پر اتر آئے۔ اس لیے انھیں ہر وقت احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اونچے طبقے کا مقابلہ نہیں کر سکتے، وہ ان سے کمتر ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے جس سے انھیں اپنی حدود معلوم ہوں اور وہ اس سے تجاوز نہ کر سکیں۔ حمراء خلیق کہتی ہیں:

طبقاتی تقسیم سے اتفاق کرتی ہوں وہ ٹھیک ہے آدمی اپنی محنت سے بڑے مقام پر چلا جاتا ہے۔ اچھا کمانے لگتا ہے۔ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت دیتا ہے۔ لیکن انسان تو برابر ہیں۔ مطلب میں دس لاکھ کما رہی ہوں کوئی اگر دو لاکھ کما رہا تو ہم دونوں مختلف تو نہیں ہیں۔ آنکھ، ناک، کان سب تو ایک سے ہیں میرے دل میں جو خواہش ہے وہ میرے گھر کام کرنے والے ملازم کی بھی ہو سکتی ہے وہ نچلے طبقے سے ہے تو کیا اس کا کچومر بنا دیں گے۔ وہ خواہش کر کیسے سکتا ہے۔ ہمیں اچھا پہننے کا شوق ہے تو اسے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے اس کا گلہ دبا دیا جاتا ہے۔ ۴۴

کچوری والا خود کو اور اپنی بیٹوں کو انتہائی کمتر سمجھتا ہے اور ان کے سکول میں داخلے کے لیے پریشان رہتا ہے۔ جب اس کی بیٹوں کے داخلے کی سفارش کے لیے سکول کا چپڑاسی راضی ہو گیا تو وہ بہت زیادہ خوش تھا:

پھر اُسے لگا کہ علی خان بھی ایک مزدور ہی ہے۔ ایک اسکول کا چپراسی۔ دن رات اسکول کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کے پاس بھی کوئی کوٹھی بنگلہ یا موٹر گاڑی نہیں ہے۔ وہ بھی اسکول کی عمارت

میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا ہے۔ اس کے دل سے بھی یہی آواز اٹھی ہو گی
کہ ایک غریب کے بچے کو بھی اسکول میں پڑھنے کا حق ملنا چاہیے۔۴۵

بچے تو بچے ہوتے ہیں غریب کے ہوں یا امیر کے ان کی ضروریات ان کے خواب سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ انھیں کیا معلوم اس دنیا کی تقسیم کیسی ہے۔ جس میں ان کے خوابوں کی تکمیل ممکن نہیں۔ انھیں کیا معلوم ہر ایک چیز کی جستجو وہ نہیں کر سکتے۔ جب کچوری والے کی بیٹیوں کو اسکول میں ٹیسٹ دلوانے کے لیے میڈم نے کہا تو اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ جب گھر پہنچ کر اُس نے یہ خوشی کی خبر اپنی بیوی اور بچیوں کو سنائی تو انھیں بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ غریبوں کے بچوں کی بھی کتنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں پیٹ بھر کر کھانا ملنے کی خوشی اور کبھی کسی کے پرانے کپڑے مل جانے پر:

اُس نے انھیں اتنا بتا دیا کہ اگلے دن صبح دس بجے پہنچنا ہے، اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر جانا ہے، کاغذ اور پنسل بھی لے جانا ہے۔۔ وہ تھک کر لیٹ گیا، لیکن اس کی بیٹیاں شاید رات بھر نہیں سوئیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی باتوں کی اور کبھی کپڑوں اور کاغذ پنسل لے جانے کے لیے بھاگ دوڑ سی نظر آتی۔۴۶

معاشرہ کبھی بھی انھیں وہ مقام و مرتبہ نہیں دیتا جس کے وہ اہل ہوتے ہیں۔ انھیں کبھی بھی اپنی برابری نہیں کرنے دی جاتی ان کے ساتھ ہونے والا سلوک بھی غیر انسانی ہوتا ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی جتنی مرضی محنت کر لیں جتنا مرضی اونچے طبقے کے ساتھ مقابلے پر اتر آئیں آجائے مگر ان کی حیثیت ایک متوسط طبقے سے تعلق کی ہی رہے گی۔ جس میں وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کسی چیز کی خواہش کریں گے تو انھیں کچل کر رکھ دیا جائے گا۔ وہ جو حیثیت لے کر پیدا ہوتے ہیں اُسی حیثیت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ کچوری والے کی بیوی بچیوں کو اسکول بھیجنے پر اس سے خفا ہو رہی تھی:

"ہم سب کچھ کرتے ہیں، کوئی ہمیں منہ نہیں لگاتا۔ صدیوں سے ہم جاہل ہیں، غریب ہیں۔"
"ہمارے بچے ایک ایک خوشی اور آرام کو ترستے ہیں۔ تمھارا دل نہیں دُکھتا کیا" اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی، "ہاں میرا دل بھی دکھتا ہے، لیکن مجھے یہ بھی پتا ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے وقت سے جس طرح زندگی گزار رہے ہیں اس میں کوئی

تبدیلی نہیں آنے والی، اور پھر ہمارا تو کوئی بیٹا بھی نہیں ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے یہ لڑکیاں بہت کچھ پڑھ لکھ لیں گی اور دفتروں میں بڑی بڑی افسر لگ جائیں گی؟ یہ لڑکیاں ہیں لڑکیاں۔"۴۷

اونچے طبقے کی برتری کی وجہ مال و دولت کی فراوانی ہے، جس میں اسے انسان انسان نظر نہیں آتا اور اس کے اندر احساس برتری پیدا ہوتا ہے جس کے باعث وہ دوسروں کو کم تر سمجھتا ہے متوسط طبقہ کبھی ان کی برابری کرنے کے بارے میں نہیں سوچتا۔ جب بھی کچوری والے کو اپنی بچیوں کے اسکول میں داخلے کا خیال آتا تو وہ خود کو بہت مایوس پاتا اس کی وجہ وہی طبقات کی تقسیم تھی۔ اُسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچوری بیچنے والا ہے اُس کے بچوں کو کہاں وہ مقام مل سکتا ہے جو امیروں کے بچوں کے پاس ہے:

کبھی کریم الدین کو مایوسی ہونے لگتی اور لگتا جیسے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی اور پھر کبھی اسے محسوس ہوتا کہ خدا نے دعا ضرور سن لی ہوگی۔ وہ صرف امیروں کا خدا نہیں ہے۔ ہم جیسوں مفلوک الحال انسان بھی اسی کے بندے ہیں۔۴۸

صفیہ اور اس کا باپ بہت بڑے بڑے خواب دیکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی ماں کو ان کے خوابوں کے ٹوٹنے کا ڈر تھا، اسے معلوم تھا کہ غریب کو اتنے بڑے بڑے خواب دیکھنے کی اجازت نہیں، کیوں کہ اس کے خواب کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ جب خواب ہی پورے نہیں ہو پائیں گے تو انھیں دیکھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ اس کے ٹوٹنے کے بعد جو تکلیف ہوگی، اس درد سے محفوظ رہنے کے لیے وہ انھیں خبر دار کر رہی تھی۔ خواب تو کوئی بھی دیکھ سکتا ہے اس پر تو کوئی پابندی نہیں:

اس کی بیوی کبھی کبھی چڑ جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اور صفیہ شاید خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ خواب جو ان جیسے کم حیثیت، دن رات محنت کر کے دو وقت کی روٹی کمانے والے انسانوں کو نہیں دیکھنا چاہییں، کیوں کہ ان کے یہ خواب کبھی پورے نہیں ہو سکتے، اور پھر ان خوابوں کے ٹوٹنے پر اُن پر کیا گزرے گی، اُسے وہ سہار نہیں سکیں گے۔۴۹

معاشرے کی اتھارتی بالائی ساخت کے پاس ہونے کی وجہ سے فیصلہ کرنے کا اختیار بھی انہی کے پاس ہے۔ وہ جب چاہیں اپنی مرضی سے جس پر چاہیں اپنا فیصلہ مسلط کر سکتے ہیں۔ ان کا اختیار ہر شعبہ ہائے زندگی پر ہے۔ جس کی وجہ

سے معاشرہ دو طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ زیریں ساخت کو بالائی ساخت کی ہر بات ماننی ہوتی ہے۔ اسی طبقے کے بتائے گئے طرزِ زندگی کے مطابق زندگی گزارنی ہوتی ہے۔

"چراغ مردہ ہوں" افسانہ معاشرے کی بالائی ساخت اور زیریں ساخت دونوں کی عکاسی کرتا ہے۔ بالائی ساخت، کی زندگیوں میں بڑی شان و شوکت ہوتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف زیریں ساخت ہے جن کو اس دنیا میں مشکل اور ذلت کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے افسانے میں واضح طور پر دونوں طبقات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ جو دنیاوی مرتبے اور شان و شوکت ہے وہ انسان کی اس زندگی تک ہی محدود ہے اس کے مرنے کے بعد وہ کام نہیں آتی، اس کے باوجود دنیا کو دیکھنے کے لیے لوگ قبرستان میں بھی قبروں کو پختہ کرواتے ہیں، وہاں پر بھی اپنی عظمت کے جھنڈے کو گاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن وہاں پر یہ ساری چیزیں نہیں چل سکتیں مصنفہ نے یہاں پر دو طبقات کا فرق واضح کیا ہے۔:

> ایک دم سے گاڑیوں کی ایک لمبی قطار نظر آئی۔ جس میں بے شمار چھوٹی بڑی گاڑیاں، گاڑیاں کے درمیان ایک ایمبولینس بھی تھی۔ اور اس قطار کے آگے پیچھے پولیس اور رینجرز کی گاڑیاں۔ جن میں بلٹ پروف جیکٹس پہنے ہاتھوں میں پستولیں اور لمبی لمبی بندوقیں لیے مسلح پولیس اور رینجرز سوار تھے۔ ۵۰

صاحب اقتدار طبقہ دنیا میں بھی کتنی شاندار زندگی گزارتا ہے اور ان کے مرنے کے بعد بھی انھیں شاندار طریقے سے الوداع کیا جاتا ہے۔ جس شخص کو مرنے کے بعد اتنی عزت ملی تھی اس کی شان و شوکت ان کی زندگیوں میں کتنی زیادہ ہوئی ہو گی۔ مادیت کی اہمیت لوگوں کی نظر میں بہت زیادہ ہے۔ جس کے پاس سرمایہ ہے لوگ اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے آگے گھنٹوں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔ اس کی عزت کی بجائے اس کی مال و دولت کی عزت کی جاتی ہے۔ اس کے عہدے کو سلوٹ کیا جاتا ہے:

> جس انسان کے بے روح، بے جان، مردہ جسم کی اس قدر عزت و توقیر ہے تو زندگی میں وہ کیا ہو گا، کون ہو گا۔ اس کی زندگی کتنی شان و شوکت سے گزر رہی ہو گی۔ اس کا کتنا دبدبہ ہو گا، کتنا رعب ہو گا۔۔ یقیناً کوئی وزیر، سفیر، جرنل، کرنل یا پھر کوئی بزنس کا ٹائی کون، جس کے سامنے ساری دنیا ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہو گی۔ کیوں نہ ہو۔ جس کے بے جان جسم کی اتنی عزت و توقیر ہو رہی ہے تو اس چلتے پھرتے جان دار انسان کے متعلق تو آپ سوچ ہی سکتے ہیں۔۔ ۵۱

دونوں طبقات میں واضح فرق افسانے کے اندر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ امیر طبقے سے تعلق رکھنے والے کے ساتھ جو لوگ آئے تھے، مادی چیزیں تو ساری وہ لے آئے تھے۔ وہ لوگ اس کی عزت و تعظیم کے لیے اس کی میت کے آگے ہاتھ باندھے بھی کھڑے تھے لیکن جو قلبی جذبات ہیں ان سے وہ لوگ محروم تھے۔ کسی کو اس کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ کسی کے بھی جذبات اس شخص کے لیے نہیں تھے۔ جب کہ دوسری طرف کے طبقے کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بہت کسمپرسی کی کیفیت میں آئے تھے۔ لیکن سب اس کے غم میں اشک بار تھے۔ اس کے پاس مادیت نہیں تھی، وہ لوگ مال و دولت سے عاری تھے اس سب کے باوجود لوگوں کی دعائیں اور ان کا ساتھ اسے نصیب تھا:

> کچھ قدموں کی چاپ۔ کچھ دبی دبی سسکیاں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ چار پانچ لوگ ایک ٹوٹی سی چارپائی پر ایک لاش لے کر آئے تھے۔ لاش پر ایک پھٹی پرانی ملگجی سی چادر پڑی ہوئی تھی، لانے والے افراد بھی نہایت مفلوک الحال تھے۔۔۔ پھٹی پرانی چادر میں لپٹی ہوئی لاش کو لانے والے اس کے دنیا سے چلے جانے پر آنسو بہا رہے تھے اور جس کے مرنے کے بعد بھی شان و شوکت میں کمی نہیں آئی تھی اس کے لیے ان سیکڑوں آدمیوں میں سے کسی ایک شخص کی آنکھ بھی اشک بار نہیں تھی۔ کس قدر تضاد تھا۔ ۵۲

جب بھی مصنفہ بڑے عہدے داروں کے بارے میں سوچتی ہیں کہ وہ جو امیر شخص تھا اس کی قبر کیسی ہوگی تو اس کے اندر اُسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی قبر کتنی روشن ہوگی؟ کتنی پر وقار ہوگی؟ جس کی زندگی میں اتنے محافظ تھے اس کی قبر کا خیال رکھنے کے لیے کتنے لوگ تعینات ہوں گے؟۔ یہ اور اس طرح کے ڈھیروں سوال سے تجسس میں مبتلا کیے رکھتے ہیں ہر انسان کی زندگی کی حقیقت مختلف ہوتی ہے۔ "کسی بھی حقیقت کے کئی پہلو ہوتے ہیں جنہیں مختلف لوگ مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں، اس لیے اُن پر اس حقیقت کے مختلف رِد عمل ظاہر ہوتے ہیں۔" ۵۱ لیکن حقیقت میں جب اس نے جا کر دیکھا تو سب اس کے برعکس تھا جیسا وہ سوچ رہی تھی، اتنا پیسا خرچ کرنے کے باوجود وہاں عجب بے رونقی تھی ایک وحشت کا احساس تھا:

> آخر کار کافی دیر تک تلاش کرنے کے بعد اس جگہ پہنچ گئی جس جگہ وہ قبر تھی، جس کی مجھے تلاش تھی۔ ایک پختہ سی قبر۔ جس کے سرھانے ایک کتبہ بھی لگا ہوا تھا، لیکن قبر کے آس پاس روکھی جھاڑیاں۔ خشک پتے اُڑتے ہوئے، چاروں طرف ویرانی۔ زندگی میں جس کی حفاظت کے لیے

اتنے پہرے دار تعینات رہتے تھے، جس انسان کو اپنی زندگی میں اپنے جیسے انسانوں سے خوف آتا تھا اب اس قبر کے اندر کس قدر بے خوف و خطر آرام کر رہا تھا۔ ۵۳

اس طرح اس کے اندر یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ وہ اس غریب کی قبر کا حال دیکھے کہ آخر اس کی قبر کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس کی قبر تو اور خستہ حال ہو گئی، جس طرح اس کی میت تھی۔ لیکن جب وہ اس کی قبر کو دیکھتی ہے تو حیران رہ جاتی ہے ۔اس کے آس پاس پھول ہی پھول تھے ایک تراوت کا احساس تھا۔ اسے دنیا میں وہ عزت نہ مل سکی جس کا وہ حقدار تھا لیکن مرنے کے بعد وہ اللہ کے ہاں سرخرو تھا:

قبر کچی ضرور تھی، لیکن ارد گرد چھوٹے چھوٹے خودرو پھولوں کے پودے۔ قبر کے آس پاس ایک خوش بو ایک مہک، ایک سکون اور طمانیت کا احساس۔ نہ قبرستان کی ویرانی، نہ انسان کی بے بسی، نہ وحشت نہ خوف۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑی رہی۔ پھر ایک زہر خند مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آئی۔ شاید قدرت خود اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ ۵۴

صاحب اقتدار طبقہ بے شک اس دنیا میں اپنے مال و دولت کے ذریعے اپنی طاقت کا زور قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جو ابدی جگہ ہے وہاں جا کر ان کا یہ پیسا، دولت اور مادیت کسی کام کی نہیں ہوتی۔ جس کا واضح ثبوت ان دونوں کی قبروں سے نظر آتا ہے۔

"میں پھول چننے آئی تھی" افسانہ زیریں ساخت کی عکاسی کرتا ہے کہ کس طرح وہ مشکلات میں زندگی گزارتے ہیں اور ساری زندگی انھیں سے لڑتے لڑتے گزار دیتے ہیں۔ جس حیثیت کے ساتھ اس دنیا میں آتے ہیں اُسی کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ افسانہ میں چھوٹی بچی کا کردار بڑا معنی خیز ہے جس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات ہیں۔ جب وہ اپنی ہم عمر رنگ برنگی فراکوں میں ملبوس بچیوں کو دیکھتی ہے تو اس کے اندر بھی ان جیسے کپڑے پہننے ان کی طرح بننے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ آخر وہ یہ سب کچھ کیوں نہیں کر سکتی آخر اس کے لیے یہ سب کیوں نہیں؟

میری اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن میرا جی یہ چاہتا تھا کہ میں ان کتابوں، کاپیوں کے اندر گھس جاؤں۔۔۔۔ میں سوچا کرتی، "کیا میں ان لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں؟ کیا مجھے یہ سب کچھ نہیں مل سکتا؟ آخر یہ لڑکیاں ان کا کیا کرتی ہیں؟ کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے؟ ۵۵

بچے تو بچے ہوتے ہیں، امیر کے ہوں یا غریب کے ان کے دل میں ان کی طرح بننے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ بھی چاہتے ہیں وہ سب کریں جو امیروں کے بچے کرتے ہیں۔ ان کے اندر اسکول میں جانے، کتابیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے۔ انھیں کیا معلوم معاشرے کی اس تقسیم کے متعلق انھیں امیر بچوں کی برابری کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ جب اپنے ہم عمر بچوں کو اسکول جاتے انھیں پڑھتا دیکھتیں ہیں تو اس کے اندر بھی ان جیسا بننے کا دل کرتا ہے۔ لیکن معاشرہ ان سے یہ سب حقوق چھین لیتا ہے۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

> ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں وہ بنیادی طور پر دو طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک وہ طبقہ ہے جو دوسروں کی محنت سے فائدہ اُٹھا کر نہ صرف عیش کرتا ہے بلکہ حکومت بھی کرتا ہے۔ دوسرا وہ طبقہ ہے جو کسی نہ کسی صورت سے اپنی محنت بیچنے کے لیے مجبور ہے۔ محنت لوٹنے والا طبقہ تمام فکری اور ادبی تحریکوں کو خیال کی حرکت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اور اس کا یہ خیال آخری منزل میں ماورائی حقیقت سے جا ملتا ہے۔ وہ ایسا سوچنے کے لیے مجبور ہے کیونکہ ہر دور کا حکمران طبقہ اپنے دور کی طبقاتی تقسیم اور سماجی صورتِ حال کو زبانی حقیقت سمجھتا رہا ہے۔ ۵۶

یہ سب چیزیں مزدور کے بچے کے لیے نہیں ہیں۔ اس بچپن سے ہی مزدوری کی طرف لگایا جاتا ہے، کبھی اپنے ماں باپ کا سہارا بننے کے لیے، کبھی ان کی بڑھتی ہوئی بھوک کو کم کرنے کے لیے۔ معاشرے کی تقسیم ہی اس طرح ہے جس وجہ سے مزدور اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی نہیں دے پاتا، جس کی وجہ سے اس کو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی مزدوری پر لگانا پڑتا ہے۔ جب کے ان کی بھی چھوٹی چھوٹی خواہشات ہوتی ہیں، انھیں بھی اسکول جانے کا شوق ہوتا ہے۔ اس بچی کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اور اپنی ماں کے ساتھ دن بھر گلی گلی نہ گھومنا، اسے کے اندر کچھ کر جانے کا جذبہ موجود تھا:

> بچپن کی وہ خواہشات جو اس وقت گھڑی دو گھڑی کو دل میں ابھرتی تھیں اب کسی لمحے پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ کاغذوں کتابوں میں گھس جانے کی خواہش۔ رنگین پینسلوں، پینسل کٹروں، خوب صوعت ربروں کو حاصل کرنے کی تمنا، مدرسے کے بڑے سے کالے پھاٹک کے اندر چلے جانے کی آرزو۔ اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں ماں کی طرح اپنی زندگی سڑکوں، گلیوں کی خاک چھانتے نہیں گزاروں گی۔ میں پڑھوں گی اور اپنے گھر کے حالات بدلوں گی۔ ۵۷

ماں باپ بھی اپنے بچوں کو مزدوری کرنے کے لیے زبردستی کرتے ہیں جس وجہ سے ان کی تعلم، ذہنیت، اخلاق اور یہاں تک کہ ان کا ادبی تعلق بھی متاثر ہوتا ہے۔ ان کے خواب تک ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس بچی کے اپنی تعلیم کے لیے دیکھے گئے خواب سب اس کی ماں کی بیماری کے باعث ٹوٹ گئے۔ جب اس کی ماں بہت دن گھر بیمار رہتی ہے تو اس سے کوئی کام نہیں ہو پاتا ان کے گھر بھوک کے لالے پڑنے لگتے ہیں۔ اس کی ماں اسے کاغذ چننے جانے کے لیے بھیجتی ہے۔ لیکن وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی طرح ذلت کی زندگی نہیں گزرنا چاہتی:

> لیکن جب تک تو استانی بنے گی ہم سب بھوک سے مر چکے ہوں گے۔ کیا تو بھوکی رہ کر پڑھ لے گی ؟ جا اٹھ وہ کونے سے بوری لے لے۔۵۸

اس بھوک کی وجہ سے ماں باپ اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ ان بچوں سے ان کی معصومیت چھین کر تلاش معاش میں لگا دیتے ہیں۔ مزدور ساری زندگی مزدوری کرتا ہے، مزدوری کرنے کے باوجود نہ مزدور کی زندگی بدلتی ہے نہ ہی اس کے بچوں کی زندگی میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ جو عمر کتابوں، کھلونوں سے کھیلنے کی وجی سے ہوتی ہے۔ اس عمر میں انھیں اپنی روزی کی فکر ہوتی ہے، وہ اپنی ماں کے آگے بہت احتجاج کرتی ہے۔ اسے یہ کام نہیں کرنا، وہ یہ نہیں کر سکتی اس کی ماں اسے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہم جس غریبی کی زندگی میں پیدا ہوئے ہیں اس میں مر جائیں گے لیکن ہماری قسمت نہیں بدلے گی:

> مگر تجھے جانا پڑے گا۔ کیا تجھے پسند ہے اور کیا نہیں، بھوک یہ نہیں دیکھتی۔۔۔ ہم غریب ہیں مجبور ہیں۔۔۔ یہ سب پیسے والوں کے چونچلے ہیں۔۵۹

اپنی بے بسی فلاس کی وجہ سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، وہ چاہیے جتنی مرضی، خواہش کوشش کر لیں، جس طبقے سے ان کا تعلق ہے، اس میں رہتے ہوئے وہ کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی قسمت میں تعلیم حاصل کرنا نہیں بلکہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے مزدوری کرنا ہی لکھ دیا گیا ہے۔

مارکس کے نظریہ بالائی ساخت کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو یہ معاشرے پر بہت سے اثرات مرتب کرتا ہے کیوں کہ اس کے ہاتھ میں پورا سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جس کو اپنے حساب سے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کی زندگیوں تک کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنے کے کاہل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مفادات کی خاطر کوئی بھی روپ اپنانے کے

عادی ہیں کیوں کہ ان کی زندگی میں نہ کا لفظ نہیں ہوتا۔ دولت کے ذریعے لوگوں کو، چیزوں کو چھیننے کے عادی ہوتے ہیں۔ بالائی ساخت کے اندر انسانیت نام کی چیز نہیں ہوتی، وہ لوگوں کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ زیریں ساخت کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آتی کیوں کہ بنیاری ضروریات زندگی پر ہی وہ قابض ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی خواہشات ہی پوری نہیں کر پاتے۔ ان کے بچے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے ہیں مگر وہ کچھ نہیں کر پاتے۔ جبکہ بالائی ساخت کا رویہ جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ ان کے بچوں تک کو احساس کمتری میں مبتلا کیا جاتا ہے، ملازم بچوں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے جائز حقوق تک سلب کر لیے جاتے ہیں۔ ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

بالائی ساخت معاشرے میں طاقتور ہونے کی وجہ سے خود کو خدا سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ نچلے طبقے کی اچھائیوں کا صلہ بھی برائیوں سے دیتے ہیں، ان کا رویہ ہمیشہ سے ظالم حکمران کی طرح ہوتا ہے۔ وہ انھیں اپنی رعایا سمجھ کر برا سلوک کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ان کی خوشیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہ نچلے طبقے کے مقابلے میں ہمیشہ اپنے جیسوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ خود کو طاقتور سمجھنے کی وجہ سے زیریں ساخت کی خودداری کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ صاحب اقتدار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس یہ حق ہے کہ وہ دوسروں کا استحصال کر سکے۔ وہ غریب طبقے کی زندگی کا ہر فیصلہ کرے گا چاہیے وہ ان کی ضروریات کے حوالے سے ہو یا ان کی زندگی کا کوئی اور پہلوں۔ وہ زندگی کے ہر معاملے کا اختیار اپنے پاس رکھتے ہیں اور پھر ان کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ ان کی عزت تک کا سودا کرنے سے گریز نہیں ہوتے وہ صرف اس کی ماہانہ اجرت کے مالک نہیں ہوتے بلکہ ان کی عزتوں کے بھی مالک ہیں جو ان کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔

صاحب اقتدار طبقے کا انداز زندگی بہت شاہانہ ہے وہ ایک دوسرے کے آگے حساس برتری پیدا کرنے کے لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مہنگی سے مہنگی گاڑی مہنگے سے مہنگا گھر خریدتے ہیں۔ کبھی کبھی کچھ تو اپنی حیثیت سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ معاشرے میں اصل اہمیت پیسے کی ہے اور ہر کوئی پیسے کا ہی پجاری ہے۔ مادیت کے نشے میں اپنے سے کم تر کو تو انسان سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ ہمارا معاشرہ دو طبقات کی جنگ میں ایسا بٹا ہوا ہے جس میں ہر ایک کے ساتھ مساوی سلوک نہ رکھنے کی وجہ سے طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہے، نچلا طبقہ خود کو کم تر سمجھتا ہے جبکہ اونچا طبقہ اسے اس بات کا احساس ہر گھڑی ہر پل دلاتا ہے، تاکہ

وہ خود کو ہمارے مد مقابل نہ سمجھ لیں۔ اس لیے انھیں ہر وقت احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اونچے طبقے کا مقابلہ نہیں کر سکتے، وہ ان سے کمتر ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے جس سے انھیں اپنی حدود کا اندازہ رہے اور وہ انھیں تجاوز نہ کر سکیں۔ ان کے بچوں تک کو احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ ان سے ہر لحاظ سے کم حیثیت رکھتے ہیں۔ جس وجہ سے وہ ساری عمر نیچے دب کر رہ جاتے ہیں

حوالہ جات

۱. ڈاکٹر روبینہ الماس "سبط حسن: مارکس اور مشرق "مشمولہ الماس (تحقیقی جرنل) شمارہ ۱۸ (۲۰۱۶ء)، ص ۱۹۔

۲. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء)، ص ۷۵۔

۳. ایضاً، ص ۷۶۔

۴. ڈاکٹر رخسانہ بلوچ "راشد بدلتا سماج اور عصری تناظر "مشمولہ الماس (تحقیقی جرنل) شمارہ ۲۲، (۲ جنوری ۲۰۲۰ء)، ص ۱۵۷۔

۵. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۷۸۔

۶. ایضاً، ص ۷۹۔

۷. ایضاً، ص ۸۰۔

۸. ایضاً، ص ۸۱۔

۹. ڈاکٹر روش ندیم، "منٹو کے ہاں طبقات کی نمائندگی کا پس منظر "مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو) شمارہ ۲۶ (دسمبر ۲۰۱۴ء)، ص ۲۵۔

۱۰. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۸۵۔

۱۱. ایضاً، ص ۸۶۔

۱۲. ایضاً، ص ۸۹۔

۱۳. حمراء خلیق، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، ۱۴ ستمبر ۲۰۲۱ء دوپہر ۳ بجے۔

۱۴. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۹۲۔

۱۵. ایضاً، ص ۹۴۔

۱۶. ایضاً، ص ۱۰۱۔

۱۷. ایضاً، ص ۱۰۲

۱۸. ڈاکٹر روبینہ الماس، "پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی شعور "مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو) شمارہ ۲۷ (جون ۲۰۱۵ء)، ص ۱۸۳۔

۱۹. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۱۰۲۔

۲۰. ایضاً، ص ۱۰۴۔

۲۱. ایضاً، ص ۱۰۴۔

۲۲. حمراء خلیق، چار کتابیں (کراچی: اشارات پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۷ء)، ص ۳۲۰۔

۲۳. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۶۴۔

۲۴. ایضاً، ص ۶۵۔

۲۵. ایضاً، ص ۶۵۔

۲۶. ایضاً، ص ۶۹۔

۲۷. ایضاً، ص ۷۱۔

۲۸. ایضاً، ص ۷۳۔

۲۹. ایضاً، ص ۵۱۔

۳۰. طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵ء)، ص ۴۷۔

۳۱. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۵۴۔

۳۲. ایضاً، ص ۵۵۔

۳۳. ایضاً، ص ۵۶۔

۳۴. ایضاً، ص ۵۶۔

۳۵. ایضاً، ص ۵۷۔

۳۶. ایضاً، ص ۵۸۔

۳۷. ڈاکٹر عنبر حسیب عنبرؔ، اردو میں ترقی پسند تنقید کا تحقیقی مطالعہ، (کراچی: احمد گرافکس، ۲۰۱۶ء)، ص ۲۸۔

۳۸. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۵۸۔

۳۹. ایضاً، ص ۵۹۔

۴۰. حمراء خلیق، بادلوں کی اوٹ (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۲۰ء)، ص ۶۱۔

۴۱. ہنری جارج مترجم آئی یو جرال، ترقی اور افلاس، (اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۲۱ء)، ص ۳۳۔

۴۲. حمراء خلیق، بادلوں کی اوٹ، ص ۶۲۔

۴۳. ایضاً، ص ۶۲۔

۴۴. حمراء خلیق، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، ۱۴ ستمبر ۲۰۲۱ء دوپہر ۳ بجے۔

۴۵. حمراء خلیق، بادلوں کی اوٹ، ص ۶۵۔

۴۶. الضاً، ص۶۶۔

۴۷. الضاً، ص۶۷۔

۴۸. الضاً، ص۷۰۔

۴۹. الضاً، ص۷۶۔

۵۰. الضاً، ص۷۷۔

۵۱. الضاً، ص۷۷۔

۵۲. ڈاکٹر نگہت ریحان خان، اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ، (لاہور: شاد سنز پرنٹرز، ۱۹۸۸ء)، ص۱۶۶۔

۵۳. حمراء خلیق، بادلوں کی اوٹ، ص۷۹۔

۵۴. الضاً، ص۸۰۔

۵۵. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص۳۷۔

۵۶. حمیرا اشفاق ترتیب و تدوین، فکری و نظری مباحث، (لاہور: سانچہ پبلشرز، ۲۰۱۲ء)، ص۶۷۔

۵۷. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص۳۸۔

۵۸. الضاً، ص۴۱۔

۵۹. الضاً، ص۴۲۔

باب چہارم

حمراء خلیق کے افسانوں کے کرداروں کا مارکسی مطالعہ

معاشرہ افراد سے تشکیل پاتا ہے اور افراد معاشرے کے ان ذہنی رویوں کے ترجمان ہوتے ہیں جو ہمارے گردوپیش میں رواج پارہے ہوتے ہیں۔ یہی افراد جب ادب کا حصہ بنتے ہیں تو ادبی کرداروں کا روپ دھارتے ہیں۔ معاشرتی تقسیم جس طبقاتی نظام کو جنم دیتی ہے، اس کے نتیجے میں ایک ہی معاشرے میں پروان چڑھنے والے یہ کردار مختلف ذہنی سطح اور فکری رویوں کے حامل ٹھہرتے ہیں۔ کارل مارکس نے جس معاشرتی نظام کو واضح کیا ہے اس میں دو طرح کے کردار سامنے آتے ہیں۔ پرولتاریہ طبقہ اور بورژوائی طبقہ۔

بورژوای طبقہ سرمایہ دار طبقے کو کہا جاتا ہے، یہ طبقہ اپنے سرمائے کی بدولت مزدور طبقہ یعنی (پرولتاریہ) کا استحصال کرتا ہے۔ جیسے جیسے اس طبقے نے ترقی کی محنت کش طبقے کی مشکلات بڑھتی گئیں۔ تاریخی طور پر قرون وسطی میں یورپ میں تاجر اور دولت مند طبقے کو اصطلاحاً بورژوائی کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں بڑی بڑی زمینیں خریدنے کے بعد یہ طبقہ لین دین سے بڑھ کر براہ راست سرمائے کی پیداوار کرنے لگا۔

پرولتاری لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، وہ شہری جو آزاد تو ہو، مگر قوت محنت کے علاوہ اس کی کوئی جائیداد نہ ہو۔ پرولتاری طبقہ سرمایہ دارانہ معاشرے کی تشکیل کرنے والی دو بڑی جماعتوں میں سے ایک ہے جو بورژوائی کی معاشی طور پر غلامی کرتا ہے۔

حمراء خلیق کے افسانے "دُعا" کے کرداروں کا مارکسی تناظر میں جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "دعا" کے کرداروں کو بہت سی مشکلات اور مصائب کا سامنا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک مزدور کا ہے جس کے سات بچے تھے اور ان بچوں کی زندگی بہت سے مسائل میں گھری ہوئی تھی۔ ان مسائل میں ایک مسئلہ عدم توجہی کا بھی تھا۔ ان

کی پرورش کے بھی بہت سے مسائل تھے۔ لیکن ان سب کے باوجود ان کا سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ غربت اور بھوک تھا۔ جو ان کے سب مسائل پر حاوی ہے۔ اظہار حیدر حمراء خلیق کے افسانوں کے کرداروں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> حمراء خلیق کے افسانوں کا انسان ایک زندہ اور متحرک حساس اور مادّی اسباب سے مسرور و دل گیر ہو جانے والی مخلوق کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ جو زندگی سے آنکھیں چار کرنے کی جرات کرتا، اس کے جذبات میں روانی، خیالات میں وسعت، فکر میں گہرائی، زبان کے استعمال میں تنوع، جمالیاتی احساس کا ایک نیا تصور لے کر سامنے آتا ہے۔ زندگی اور سماج کا قریبی اور آشنا آہنگ سنائی دیتا ہے جو افسانے میں شعور اور تاریخی حقائق کے رابطے ملاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں ماحول کی تلخی اور چبھن محسوس کی جاتی ہے۔[1]

بھوک افسانے کے اندر ایسی بیماری ہے جس کا اثر افسانے کے ہر کردار پر پڑتا نظر آتا ہے۔ چاہے، وہ ماں باپ ہوں یا بچے، غربت اور بھوک کی وجہ سے ماں باپ آپس میں لڑتے تھے، بچوں کو مارتے تھے ان کی شکل تک دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن ہر سال پھر ایک نئے بچے کو جنم دیتے تھے۔:

> ایک دوسرے سے لڑتے تھے۔ مارتے مرتے تھے۔ گالم گلوچ کرتے تھے۔۔۔ بھوک۔۔۔ تھکن اور ساری نفرتوں اور مایوسیوں کا غصہ بچوں پر نکالتے تھے اور پھر ایک سال بعد ایک نئی زندگی کو جنم دے دیتے تھے۔ اس جہنم میں ایک بھوکے ننگے انسان کا اضافہ کر دیتے تھے۔[2]

ماں باپ کا برتاؤ بھوک اور غربت کے باعث اپنے بچوں کے ساتھ عدم توجہی کا ہے۔ جب وہ ان کی ضروریات پوری نہ کر پاتے تو ان کے ساتھ بد سلوکی سے پیش آتے۔ یہ معصوم کردار اس معاشرے میں زبردستی مسلط کر دیے گئے، ہیں، اب معاشرہ یہاں تک کہ ان کے گھر والے بھی ان کو قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔ یہ معاشرے کی ایسی تقسیم جس میں مزدور پوری زندگی محنت کرنے کے باوجود مزدور ہی رہتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں دے پاتا۔ جب ان کا باپ غربت کی وجہ سے مر گیا تو ان پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی اور ان کی ماں اس کا الزام بچوں کو دے رہی تھی:

میں تو نصیبوں جلی۔۔ یہ کم بخت۔۔ منحوس آدم خور باپ کو کھا گئے۔۔ مر گیا وہ بد نصیب ان کے ایندھن بھرتے بھرتے۔۔ اب کہاں سے کھاؤ گے۔۔ کیا کرو گے۔۔ خون تھکوا دیا کتوں نے اسے۔۔ اب چین آ گیا۔[۳]

افسانے میں صابر نامی کردار جوان کے بڑے بیٹے کا کردار ہے، اس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی دو وقت کی روٹی تھی جو اسے میسر نہیں تھی۔ اس کے ماں باپ نے اسے دنیا میں لانے کہ بعد دیا ہی کیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ غربت ہے۔ اس غربت کے باعث زندگی میں بہت سے معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے مزدور طبقہ بنیادی ضروریات سے ہی محروم رہتا ہے:

چار پانچ دن سے کسی نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ باپ جب سے پلنگ پر لگا تھا انھیں سوائے لاتوں، جوتوں اور کوسنوں کے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا لیکن اس وقت کھچڑی کی خوشبو۔۔ وہ اب کتنی دیر صبر کرے، کب تک برداشت کرے۔ اسے ماں پر سخت غصہ آ رہا تھا، وہ اٹھتی کیوں نہیں؟ اور پھر اسے اس پڑوسن پر غصہ آنے لگا جو ماں کو اٹھائے جا رہی تھی اور انھیں کھانا نہیں دے رہی تھی۔[۴]

صابر کے کردار کے اندر بے حسی غالب ہے۔ باپ کے مرنے پر بھی اس کے اندر بھوک کی اشتہا زور کر رہی ہوتی ہے۔ اس وقت سب بچوں کو صرف کھانے کی پڑی ہوتی ہے اور جب انھیں کھانا مل جاتا ہے تو ہر ایک اس ریس میں لگا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ کھا سکے۔ یہ ایسی ریس تھی جس میں سب ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں لگے تھے، کوئی ہارنا نہیں چاہتا تھا:

اللہ میاں کل کو میری ماں مر جائے۔ پرسوں کو میری بہن مر جائے اور پھر میرا بھائی۔۔۔ اور سب یوں ہی مرتے جائیں۔[۵]

صابر کے لیے موت کا تجربہ ایسا تھا جس میں انھیں پیٹ بھر کر کھانا میسر ہوا تھا۔ اسے اپنی مختصر زندگی میں موت کی بس یہی سمجھ آ سکی کہ جب ان کے گھر کوئی مرے گا تو ہی وہ لوگوں کے لیے توجہ کا مرکز بنیں گے اور انھیں کھانا ملے گا۔ اس لیے صابر اللہ سے تڑپ کر سب کی موت کی دعا کرتا ہے۔ اُسے یہ انداز ہو چکا تھا کہ عمر بھر چاہے بھوکے مر

جائیں کسی کے لیے وہ مرکزِ نگاہ نہیں بن سکتے۔ حمراء خلیق نے "دعا" افسانے کے کرداروں کے ذریعے معاشرے کی بے حسی اور لاپروائی کی عکاسی کی ہے۔

"حوا کی بیٹی" افسانے کا مرکزی کردار ایک عورت کا ہے جس نے اپنی غربت کی وجہ سے جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر بڑی مشکل سے گزارا ہے۔ یہ کردار معاشرے کی بہت سی ایسی عورتوں کی عکاسی کرتا ہے جن کی مجبوری کا فائدہ بہت سے طاقت ور مرد اٹھاتے ہیں۔ ان کی نظر میں عورت مجبور ہوتی ہے جس کا کوئی سہارا نہیں ہے، وہ لاچار ہے۔ کرن ہارنی نے لکھا ہے کہ یہ جو عورت کی پیدائشی اور حیاتیاتی سطح کے احساس کمتری کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ غلط مفروضہ ہے۔[6] مرد عورت کو کمزور تصور کر کے اس پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں تعلقات تو قائم کر لیتے ہیں لیکن دن کی روشنی میں اُسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اپنی خواہشات تو پوری کر لیتے ہیں لیکن انھیں لوگوں کے سامنے اپنی عزت بنانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ "حوا کی بیٹی" افسانے میں موجود بھکارن جس نے اپنی جوانی کی عمر انتہائی مشکلات میں بسر کی، اب اپنی عمر کے آخری حصہ میں کراچی کی عظیم شاہراہ پر بھکارن کے روپ میں بیٹھی نظر آتی ہے۔:

> اس پر وہیں بیٹھے بیٹھے نہ معلوم کتنے موسم گزر چکے تھے۔ کتنے ہزار لوگوں نے اس پر رحم کھایا تھا۔۔ اسے بھیک دی تھی۔۔ اور کتنے ایسے بھی تھے جو محض اس پر ایک نفرت اور تحقیر کی نظر ڈال کر گزر جایا کرتے تھے۔۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو شاید جانتے تھے کہ وہ دراصل کون تھی؟[7]

اس نے غربت کی وجہ سے اپنے پیٹ کی خاطر مشکلات میں زندگی بسر کی، اسی پیٹ کی وجہ سے اس نے اپنا جسم تک بیچ دیا۔ کسی نے اس پر رحم نہیں کھایا، ہر شخص نے اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھایا۔ اس ظالم دنیا نے اس کے جسم کی بوٹی بوٹی کو ادھیڑ کر رکھ دیا:

> ہر رات۔۔ ہر شب ایک نیا انسان اس کا ہاتھ تھامتا۔۔ وہ دونوں رات کی خاموشی اور تاریکی میں کہیں گم ہو جاتے۔ لیکن پھر اگلی شام وہ لڑکی وہاں ایسے ہی کھڑی ملتی جیسے ہمیشہ سے وہیں کھڑی تھی۔[8]

اس کردار کے ذریعے بہت سی چھپی ہوئی معاشرتی بیماریوں کو موضوع بنایا گیا ہے، جن کے اندر معاشرتی بگاڑ پایا جاتا ہے۔ اس لڑکی کے بارے میں کبھی کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون تھی، کہاں سے آتی تھی اور کہاں جاتی تھی۔ کسی کو اس کی زندگی سے کوئی غرض نہ تھی۔ اس معاشرے نے اس سے ہر رات نئے نئے تجربات کروا کر اس کی جوانی چھین لی تھی:

> بڑی لمبی مسافت کے بعد جیسے اب وہ بالکل تھک چکی تھی۔ زندگی کے اس سفر میں اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔۔ سب کچھ لٹا دیا تھا۔۔ سب کچھ گنوا دیا تھا۔۔ اور کچھ بھی تو نہیں پایا تھا۔[9]

یہ کردار ایک تنہا عورت کی ترجمانی کرتا ہے جس کی مجبوری کا فائدہ چند پیسوں کے عوض ہر مرد اٹھاتا ہے۔ "حوا کی بیٹی" کا کردار ہر بار کسی نئے مکروہ کردار کی ہر رات زینت بنتا رہا۔ اس نے اپنا حسن اپنی جوانی ہر چیز ضائع کر دی لیکن اس کی قدر کسی نے نہیں کی۔ وہ اپنا سب کچھ تھک ہار کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔ دنیا نے اُسے بھکارن کا نام دے دیا۔ وہ گونگی بہری بن کر ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہتی تھی۔ کبھی کوئی کچھ دے جاتا، کوئی حقارت کی نظر ڈال جاتا اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس دنیا کی بے حسی اور بے رحمی کے آگے وہ اب پتھر کی ہو چکی تھی۔

> زندگی کے اسٹیشن پر وہ ایک ایسا تنہا مسافر تھی جس کے سامنے سے گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ اسے آگے جانا تھا لیکن زادِ راہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ تھک کر اسی جگہ بیٹھ گئی پھر وقت نے اسے بھکارن کا نام دے دیا۔[10]

اتنی مشکلات، اتنا سب کچھ دیکھنے کے باوجود جب وہ عمارت گری اور اس کے گرنے کے ساتھ اس کا کردار بھی نیست و نابود ہو گیا ایسے جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اس انسانوں بھرے معاشرے میں کوئی ایک بھی اُس کا نہیں تھا۔ اس کا جسم تنہا ملبے کے نیچے پڑا تھا، وہاں پر موجود کوئی بھی اس کا اپنا نہیں تھا۔ کوئی رشتہ ایسا نہ تھا جو اُسے کندھا دے سکے۔ کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے اس کی میت پر ایک آنسو بھی بہایا ہو۔ ساری عمر بے نام زندگی جی کر آج وہ بے نام موت مر گئی اور کسی کو اس کے مرنے کا غم بھی نہ تھا:

> وہ بھی شاید ایک عمارت تھی جو اپنی جیسی دوسری عمارت کے ساتھ ڈھے گئی۔[11]

اس بھکارن کے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جب تک دنیا کو اس کی ضرورت تھی تب وہ ان کے کام کی تھی، اب اس کی بوڑھی ہڈیوں کا کسی نے کیا کرنا تھا۔ ان کی نظر میں اس کی حیثیت اُسی عمارت کی ہی طرح تھی جس کے آگے وہ بیٹھی تھی۔ اس کا جسم بھی اس عمارت کے اندر لگی اینٹوں کی طرح تھا، بے جان جس کو جہاں دل ہو لگا دیا جائے۔

"یونس بھائی" افسانے کا مرکزی کردار یونس بھائی کا ہے جس کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ یہ کردار انتہائی محنتی، اپنے کام سے کام رکھنے والا، خوددار، دوسروں کا ہمدرد اور ہر ایک کے کام آنے والا ہے۔ یونس بھائی کی فٹ پاتھ پر لگائی گی چھوٹی سی دکان تھی جس میں بچوں کی ضروریات کی تمام چیزیں موجود ہوتی تھیں۔ کاغذ کے دستے، پنسلیں ، ربر، شاپنرز، سکیل، پینسل باکس وغیر۔ سال کا شروع ہو یا درمیان، امتحانات سر پر ہوں یا ختم ہو رہے ہوں ان کے پاس بچوں کا ہجوم ہمیشہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی بھی کسی بچے سے غصے سے پیش نہیں آتے تھے۔ ہر ایک کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ ان کا ساتھ سکول کے ساتھ اتنا ہی پرانا تھا جتنا کہ یہ اسکول۔ یونس بھائی اپنی غربت کی وجہ سے سکول کے باہر دکان لگانے پر مجبور ہو گئے تھے:

> میرے بھائی بھاوج نے مجھے نکال دیا ہے حالانکہ وہ بہت مالدار ہیں۔ میری بھاوج کا کہنا ہے کہ چونکہ میں کچھ کماتا نہیں ہوں اس لیے وہ میری ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔ اصل میں میری صحت زیادہ اچھی نہیں رہتی ہے اس لیے میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ لیکن اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں محنت مشقت کروں گا۔ ان پر بوجھ نہیں بنوں گا۔ ۱۲

وہ معصوم سی شخصیت کا مالک تھا، اسے زندگی کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ بالکل نہیں تھا۔ اس کے گھر والوں کے رویے سے اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچی اور اس نے اپنی محنت اور مزدوری شروع کر دی۔ پورا دن وہ اسکول کے اندر ڈیوٹی دیتا۔ ہر شخص کی خدمت کرنا اس نے اپنا فرض سمجھ لیا۔ آہستہ آہستہ اسکول کے چھوٹے موٹے کام ان کے سپرد ہو گئے تھے جو وہ بغیر کسی لالچ کے کرتے تھے:

> اگر کوئی چپراسی دوسرے کاموں میں مصروف ہے تو کوئی بات نہیں۔ یونس بھائی ہر کام کے لیے حاضر ہیں۔ کسی ٹیچر کو کوئی چیز منگانا ہے، یونس بھائی بسر و چشم تیار۔ بہت بڑا اسٹاف ہونے کی وجہ سے ہاف ٹائم میں ناشتا وغیرہ لانا ایک چپراسی کے بس کا نہیں، یا وہ کسی اور کام میں مصروف ہے، کیا

فکر ہے یونس بھائی تو ہیں۔ دس ٹیچر زناشتا منگا رہی ہوں یا بیس، یونس بھائی سب کا سامان لانے کو تیار۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کا منگایا ہوا سامان غلط ہو گیا ہو یا حساب میں ایک پیسے کی بھی غلطی ہو گئی ہو۔ ۱۳؎

افسانے میں موجود یونس بھائی کے کردار نے اپنی غربت، مفلسی کو اپنی مجبوری نہیں بننے دیا، بلکہ حالات کا مقابلہ کیا، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے اور اپنی محنت مزدوری کر کے پیٹ پالا۔ وہ ہر ایک کی ضرورت اور خوشی کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن وہاں پر کسی کو ان کی زندگی کے اندر رہونے والے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اگر آج وہ خوش ہیں تو کیوں خوش ہیں اس کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کسی نے ان کے حالات کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔ کیوں کہ ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف تھا۔ ایسا ان کی زندگی میں اچانک سے کیا ہوا کہ شادی کی تیاریوں میں مصروف شخص شادی ادھوری چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ کسی نے اس سے جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ آخر اس کی زندگی میں اتنا بدلاؤ کیوں آگیا ہے:

اب ان کے چہرے پر ایک دکھ، ایک کرب ضرور پھیل گیا تھا۔ ان کے مزاج میں تبدیلی آگئی تھی۔ وہ چڑچڑے سے ہو گئے تھے۔ انھیں غصہ بھی جلدی آنے لگا تھا۔ بچوں کو بھی ڈانٹ دیتے۔ کبھی موڈ نہ ہوتا تو ٹیچرز کے کام کو بھی انکار کر دیتے لیکن اس کے باوجود اسکول کے کاموں کو ایسے اپنا فرض سمجھ کر کرتے جیسے ان کی زندگی اسکول سے نتھی ہو۔ ۱۴؎

معاشرے میں موجود بہت سے ایسے کردار ہیں جو دن رات اپنی غربت کی وجہ سے ایسی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔ کبھی لوگوں کے آگے اپنی کم حیثیتی کی وجہ سے تو کبھی ذات پات کی وجہ سے وہ بے نام رہتے ہیں۔۔ ہمارے معاشرے کی تقسیم ہی ایسی ہوئی ہے کہ لوگوں کو ان کی ذاتی شخصیت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی حیثیتی کی وجہ سے جانچا جاتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن سماج کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایک سماج میں متعدد حقیقتیں ہوتی ہیں، جو مختلف بھی ہوتی ہیں اور متصادم بھی، ایسی پیچیدہ صورت حال میں معاصرانہ حقیقت کا تعین اور بھی دشوار ہوتا ہے۔ ہر دور اور ہر سماج کی معاصرانہ حقیقت کے تعین کا اختیار فنکار کو ملنا چاہیے اور اسے اس کا پورا استحقاق ہے کہ وہ اپنی بصیرت اور شعور کے مطابق معاصرانہ حقیقت کا تعین کرے۔ ۱۵؎

معاشرہ یونس بھائی جیسے کرداروں سے بھرا پڑا ہے۔ جنہیں لوگ احساس کمتری سے ہی مار دیتے ہیں۔ یونس بھائی کے غم میں ان کے سکول والے ایک دو دن شریک رہے، ان پر ترس کھایا پھر سب لوگ بھول گئے اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ معاشرے میں لوگوں کی بے حسی کی وجہ سے کوئی کسی کے درد و غم میں شریک نہیں ہوتا، لوگوں کو کسی کے معاملات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی بھوک سے مرے یا کسی اور وجہ سے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یونس بھائی کے ساتھ ہوئے دھوکے نے ان کی ہنسی چھین لی ان کے مزاج میں موجود ٹھہراؤ بھی کہیں غائب تھا اور اب وہ بچوں پر غصہ کرنے لگے تھے۔ کام کرنے کو دل نہ ہوتا تو اساتذہ کو انکار کر دیتے تھے۔ اس معصوم شخص نے بھلا کسی کا کیا بگاڑا تھا جو ان کے ساتھ ایسا ہوا۔

"سو روپے کا دوپٹہ" افسانے کا مرکزی کردار رضیہ نامی عورت کا ہے۔ جس کا شوہر ایم سی میں جمعدار تھا۔ شوہر کی تنخواہ اچھی ہونے کی وجہ سے وہ گھر میں رہتی تھی۔ اس کے شوہر کے بقول وہ گھر کی رانی تھی۔ اسے کیا ضرورت ہے کام کرنے کی۔ اس کے شوہر کی اچانک موت کی وجہ سے اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس کے گھر کا واحد کفیل اس کا شوہر تھا، جس کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ اب اس کے پاس آخری انتخاب نوکری تھا۔ چنانچہ اس نے دوسروں کے گھر کام کرنا بھی قبول کر لیا اور اسے اپنی غیرت کا مسئلہ نہیں بننے دیا:

> ان دونوں گھروں میں بات کر کے جب وہ گھر پہنچی تو پلنگ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ آج اسے "بالا" بہت یاد آ رہا تھا۔ بچے حیران پریشان اسے دیکھ رہے تھے۔ چھوٹا بیٹا اس سے لپٹ گیا، "اماں تو کیوں رو رہی ہے؟" بچے کی آواز پر وہ چونکی، "نہیں پتر میں رو تو نہیں رہی" اس نے جلدی جلدی پلو سے آنسو پونچھے۔[16]

زندگی بھی انسان سے کیا کیا نہیں کرواتی جو کام اس نے اپنے خواب میں نہیں سوچے ہوتے وہ سب بھی کر گزرتا ہے۔ وقت کبھی بھی ایک سا نہیں رہتا۔ وہ انسان کو سرد و گرم میں جینا سکھا دیتا ہے اسی طرح رضیہ کو بھی سکھا گیا۔ وہ جو اپنے گھر میں رانی بن کر رہتی تھی، شوہر کے ناز و نخرے میں پلی آج اس کے مرنے کے بعد بھوکے ننگے سو جاتی تھی۔ وہ گھر کی رانی رضیہ اب اپنے بچوں کے پیٹ کی خاطر لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی:

> وہ ڈرپوک سی، ہر بات پر سہم جانے والی رضیہ وقت کے سرد و گرم اٹھاتے اٹھاتے مضبوط اور بہادر ہو گئی تھی۔ پھر اس کے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے جو اس کی طاقت تھے۔[17]

رضیہ دنیا کے رسم ورواج میں جینا سیکھ گئی تھی، اس نے اپنے بچوں کی خاطر ساری زندگی لوگوں کے گھروں میں محنت سے کام کیا۔ ان کی ضروریات کو پورا کیا، جب بچے جوان ہوئے ان کی شادیاں کیں۔ وہ خوش تھی اس نے اپنے فرض کی ادائیگی کر لی تھی۔ اس کے بڑے بیٹے کے گھر بچے ہوئے رضیہ کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹھہرتے تھے۔ دن رات ان کی باتیں کرتی تھی، بیمار ہو جاتے تو لوگوں سے مانگ مانگ کر دوائیں لے جا کر کھلاتی تھی۔ ایڈوانس تنخواہ لے جا کر ان کے کپڑے خریدتی تھی۔ بدلہ میں اس کا بیٹا عمر کے آخری حصے میں ماں کو تنہا چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ آخر اس کا بیٹا بھی اسی بے حس دنیا کا حصہ تھا۔ جس ماں نے انھیں پالنے کے لیے دن رات لوگوں کی خدمت کی اسی ماں کو ظالم دنیا میں بے سہارا چھوڑ دیا۔ نچلا طبقہ پیسے کی قلت ہونے کی وجہ سے پوری زندگی اونچے طبقے کی غلامی میں گزارتا ہے۔ پھر بھی ان کی ہوس پوری نہیں ہوتی افسانے میں بھی ان کرداروں کی بے حسی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے:

> ایک دن اچانک پتا چلا کر رضیہ چلی گئی۔ بغیر کچھ کہے سنے۔ کیوں؟ کہاں؟ کئی دن گزر گئے۔ کس سے معلوم کیا جائے، کون بتائے گا؟ اس کے ساتھ آنے والی ماسیوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی۔ کئی روز بعد ایک ماسی نے بتایا کہ وہ گھر پر ہے اور بہت بیمار ہے۔[18]

رضیہ نے پوری زندگی لوگوں کے گھروں میں کام کیا، مگر مجال ہے کسی کی چیز کو کبھی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ وہ کچھ دنوں سے ایک نئے گھر میں کام کر رہی تھی۔ اس عورت نے الزام لگایا کہ اس کا دوپٹہ کھو گیا ہے اور وہ رضیہ نے چوری کیا ہے۔ معاشرے میں موجود بورژوائی طبقے کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ جب چاہے جس کو چاہیے ذلیل کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس اختیار ہے کہ وہ لوگوں کی عزت کا ان کے جذبات واحساسات کا جیسے چاہے سودا کر لے اور ان کو کام دینے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں تک کے مالک بن جائیں، معاشرے میں انہی کی اجارہ داری ہے۔ رضیہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا سلوک کیا گیا:

> بی بی! کیا بتاؤں۔ میں تو ختم ہو گئی۔ زندگی میں، میں نے اتنے غم اور دکھ دیکھے، فاقے کیے، بیماریاں اٹھائیں لیکن اتنا برا کبھی نہیں ہوا میرے ساتھ۔" اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔[19]

اس کی سالوں کی کمائی گئی عزت کا پل بھر میں جنازا نکال دیا گیا۔ صاحبِ اقتدار طبقے کے پاس اختیارات آجانے کی صورت میں اس حد تک تجاوز کر جاتے ہیں کہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کی عزت نفس اس کی خودداری تک کو

پامال کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی بیماری تک کی چھٹی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ ان کی زندگیاں ان کے پاس گروی پڑی ہوتی ہیں۔ حمراء خلیق اپنے افسانوں کے کرداروں کے حوالے سے کہتی ہیں

میرے افسانوں کا ہر کردار میری اپنی شخصیت لگتا ہے۔ میں نے اپنے کرداروں کو یوں اہمیت دی کہ میں ان کی جگہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ ۲۰

ایک سو روپے کے دوپٹے کی وجہ سے رضیہ کی سالوں کی خوداری کا بھی پاس نہ رکھا گیا۔ رضیہ اس غم کو برداشت ہی نہیں کر سکی:

اگلے دن پتا چلا وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی اس دنیا سے جس نے اس کی محنت کا مول فقط سو روپے لگایا اور وہ انھیں حوالہ پولیس کرنے کی دھمکی بھی نہ دے سکی۔ ۲۱

افسانہ میں رضیہ کا کردار پرولتاریہ طبقے کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے اندر بورژوائی خود ہی قانون کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ وہ خود ہی قانون کے محافظ بن بیٹھے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں ان کو غریب کا ہر فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ رضیہ دونوں طبقوں کی اس کشمکش کے آگے تاب نہ لاتے ہوئے اپنی جان کی بازی ہار جاتی ہے۔

"آخر میرا قصور" افسانے کا مرکزی کردار برکتے نامی عورت کا ہے جو لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے۔ اس کا تعلق ایک بستی سے تھا جہاں اس جیسی اور بہت سی کام والی عورتیں رہتی تھیں۔ جن کے شوہر مختلف جگہوں پر مزدوری کرتے تھے۔ برکتے کا شوہر بھی مزدوری کرتا تھا۔ کچھ دن پہلے ایک عمارت میں مزدوری ملی تھی، تو وہاں سیڑھی ٹوٹ جانے کی وجہ سے اینٹیں اس کے ہاتھ پر گریں اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ یہ خبر برکتے پر بجلی بن کر ٹوٹی تھی۔ کیوں کہ اب پھر اس پر شوہر کے ساتھ ساتھ آٹھ بچوں کی ذمہ داری آ گئی تھی۔ اب وہ بیچاری کیا کرے گی اس پر تو مصیبتوں کا پہاڑ آ گرا تھا۔ وہ بہت مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کون جس سے اپنی مشکلات کا ذکر کرتی:

ساری مصیبتیں اُسے اکیلے ہی جھیلنا تھیں۔ کبھی کبھی تو عاجز ہو جاتی کہ دل میں ٹھان لیتی کہ سارے بچوں کو زہر دے کر خود بھی کھا لے گی اور دنیا کے الجھیڑوں سے نجات ہو جائے گی۔ مگر

یہ بھی کوئی آسان بات نہیں تھی اور پھر جب کوئی بچہ اسے پیار سے اماں کہہ کر بلاتا تو اس کا سارا غم و غصہ کافور ہو جاتا۔ ۲۲؎

اس معاشرے کے اندر جب لوگوں کو دو وقت کی روٹی ہی میسر نہیں ہو گی تو وہ کیسے زندہ رہ سکیں گے۔ صاحب اقتدار طبقہ اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے، اسے کسی کے زندہ رہنے یا مر جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کے لیے کسی کا ہونا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، وہ اپنی ذات کے پجاری ہیں۔ ان کو کسی برکتے کے شوہر یا بچوں کے ہونے یا نہ ہونے سے کی کوئی غرض نہیں، انھیں دو وقت کی روٹی ملے نہ ملے وہ بھوکے مریں یا اجتمائی خودکشی کریں ان سب کی اہمیت ان کی نظر میں کچھ نہیں ہے۔ برکتے کی زندگی دن بدن مشکل ہوتی جا رہی تھی اگر شوہر کا علاج کرواتی تو بچے بھوکے مر جاتے اگر بچوں کو دیکھتی تو شوہر نہ رہتا:

ارے مردار۔۔ چپ ہو جاؤ۔۔ کم بختوں مجھے مار ڈالو۔۔۔ میری بوٹیاں بنا کر کھالو۔۔ منحوسوں کا تندور ہی نہیں بھرتا۔۔ کہاں سے لاؤں۔ کوٹھے پر بیٹھ جاؤں جا کر۔۔ اب تو وہاں بھی کچھ نہیں ملے گا۔ ان بوڑھی گلی سڑی ہڈیوں کی کون قیمت لگائے گا۔ ۲۳؎

جب دو وقت کی روٹی میسر نہ ہو تو انسان خود کو بیچنے تک کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ برکتے اس بے حس دنیا سے اتنی مایوس ہو چکی تھی اس کے لیے آسان حل یا تو بچوں کی جان لینا تھا یا خود کو کوٹھے پر بیٹھا لینا تھا۔ وہ دن بھر بچوں کو گالیاں دیتی رہتی ہر مشکل کی وجہ انھیں قرار دیتی تھی کیوں کہ وہ ان کی دو وقت کی روٹی ہی پوری نہیں کر پا رہی تھی۔ نچلا طبقہ مجبور ہو کر اپنے بچوں کو بچپن سے ہی مزدوری کرنے کی عادت ڈال دیتا ہے۔ وہ کبھی اپنے ماں باپ کا سہارا بنے کے لیے، کبھی ان کی بڑھتی ہوئی بھوک کو کم کرنے کے لیے مشقت طلب کام کرتے ہیں۔ جب اس کی ایک سہیلی نے اپنے بچوں کو کام پر بھیجنے کے لیے کہا تو وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھی، کیوں کہ برکتے کی اپنی زندگی بچپن سے مشکلات میں گزری تھی۔ اس کی ماں نے اسے کسی کے گھر میں ان کے بچے کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑا تھا۔ وہاں پر ہونے والے مظالم کی تلخ یادیں اس سے وابستہ تھیں:

یہ دال نہیں کھائیں گی۔ سنا ہے گھر میں روکھی سوکھی روٹی بھی نصیب نہیں تھی یہاں دال سبزی کھانے سے بھی انکار ہے انھیں گوشت اور مرغی چاہیے۔ ہماری برابری کرنے چلی ہیں۔ بس یہی تو بات ہوتی ہے چھوٹے لوگوں کی، چار دن پیار سے کیا رکھ لیا کہ دماغ ہی خراب ہو گیا۔ ۲۴؎

یہاں طبقات کی ایسی جنگ ہے جس میں نسلوں کی نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ بورژوائی طبقہ پرولتایہ کو کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان کے لیے یہ بات قابل قبول ہی نہیں ہے کہ نچلا طبقہ ان کی برابری کرے۔ ہر وہ چیز جس کو بورژوائی استعمال کرتے ہیں کسی دوسرے کو وہ استعمال کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہ تو ان کے بچوں کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جس طرح کے سکولوں میں ان کے بچے جاتے ہیں، جس طرح کے خواب دیکھتے ہیں اس سب کی غریب طبقے کو اجازت نہیں ہے۔ برکتے چھوٹی بچی تھی اسے ان سب باتوں کی سمجھ نہیں تھی۔ جو گڑیا کر سکتی ہے کھا سکتی ہے اسے ان سب کی اجازت کیوں نہیں اسے ہر کام اپنی مرضی سے کیوں نہیں کرنا۔ اب تو اس سے گڑیا کی امی نے نرمی سے بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی:

> اب تو اس کی کبھی کبھی پٹائی بھی ہو جاتی۔ کام میں دیر سویر ہو جاتی یا گڑیا سے لڑائی ہو جاتی یا کسی وقت اس کا کھیلنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا ہوتا اور گڑیا کی ضد ہوتی کہ وہ ضرور کھیلے تو ظاہر ہے شامت تو برکتے ہی کی آتی۔ ۲۵

نچلے طبقے کے جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ان کو بس بھیڑ بکریوں کی طرح نکا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ برا رویہ رکھا جاتا ہے، انھیں اس چیز کا احساس دلایا جاتا ہے وہ ان سے کم حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی حوالے سے ان کی برابری نہیں کر سکتے، نہ کھانے پینے میں نہ پہنے اوڑھنے میں۔ احمد علی اپنے ایک مضمون میں نچلے طبقے کے لیے لکھتے ہیں:

> ہمیں چاہیے کہ صرف ایک طبقے یا جماعت کے لیے نہ لکھیں بلکہ جدوجہد کرنے والی مخلوق سے اپنے آپ کو وابستہ کر دیں اور ان کروڑوں آدمیوں کو مخاطب کریں جو بھوک، غربت اور مصیبت میں رہتے ہیں کیونکہ وہی ہماری آج کی پبلک ہیں اور وہی آیندہ کی پبلک ہوں گے۔ ۲۶

برکتے چھوٹی بچی تھی لیکن کسی نے اس کا احساس نہ کیا اسے اس چیز کا احساس دلایا کہ گیا اس کی حیثیت کسی کیڑے مکوڑے سے زیادہ کی نہیں ہے۔ جس بچی کے کھیلنے کودنے کی عمر تھی اس کو طبقات کی جنگ میں دھکیلا گیا۔ اس کے اندر احساس کمتری ڈال دیا گیا۔ اس کے ذہن میں یہ ڈال دیا گیا کہ اس کا تعلق ایک ایسے علاقے جگہ، ایسے لوگوں سے ہے جو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ حیثیت عہدہ اور مرتبے میں ان سے بہت کم تر ہیں۔ وہ کبھی ان کے مقابلے میں نہیں آسکتی بلکہ ہمیشہ ان سے نظریں جھکا کر بات کرے گی۔ بچپن میں اس کے ذہن میں ڈالی گئی باتیں ہمیشہ کے لیے

اس کے ذہن میں رہ گیئں، جب اس کی سہیلی نے اس کی بیٹی کو کسی کے گھر کام کے لیے کہا تو وہ مکر گئی۔ وہ کسی کے رحم و کرم پر اپنی بیٹی نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

"ہمایوں بخت" افسانے کا مرکزی کردار ایک تیرہ سال کے بچے کا ہے۔ جو عوامی بیت الخلا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اسی کی عمر کا نہایت تیز طرار لڑکا بھی ساتھ ہوتا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ لڑکا اکیلا ہی وہاں کھڑا ہوتا تھا۔ وہ کچھ بولتا نہیں تھا بس لوگوں کے آگے ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔ ایک دن بیت الخلا کے سامنے خلاف معمول بہت رش تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہو۔ لوگوں کی آوازیں تھیں، شور و غل مچا تھا، وہاں اس بچے کے ساتھ کوئی ماجرا تو پیش نہیں آیا۔ اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی، اس ظالم دنیا کے ہاتھ نہ لگ جائے یہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔ جب بھیڑ کم ہوئی۔ تو اسے میں ساتھ لے آئی وہ ڈرا ہوا خوف زدہ سا بچہ جس کے حلق سے آواز بھی مشکل سے نکل رہی تھی جو اس ظالم دنیا کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہا تھا:

> وہ رُکا، جھجکا اور پھر بے تکان بولتا گیا۔ اس کے لہجے میں شائستگی، نرمی اور دھیما پن تھا۔ وہ بول رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ بھی اس کے آنسو نہیں پونچھے۔ اُسے ذرا بھی تسلی نہیں دی اور نہ اُسے خاموش ہو جانے کو کہا۔ اُسے رونے دیا، اُسے بولنے دیا۔ وہ بے بسی اور مجبوری اور لاچاری جس کا وہ کسی سے ذکر نہیں کر سکتا تھا، اپنے دل کے زخم کسی کو نہیں دکھا سکتا تھا، کیوں کہ اس کا کوئی ہم درد نہیں تھا، اس کا کوئی غم گسار نہیں تھا، وہ اسی دنیا کا، اسی معاشرے کا ایک حصہ تھا لیکن اس بھری دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے آج سب کچھ کہنے کے بعد اس کی گھٹن ختم ہو جائے، میں نے سوچا۔ میں سنتی رہی اور وہ بولتا رہا۔ ۲۷

اس کا تعلق ایک انتہائی امیر گھرانے سے تھا۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے اس کے ناز نخرے اٹھائے جاتے تھے۔ دنیا کی ہر خواہش پوری کی گئی۔ اونچے طبقے کے لوگ اپنے بچوں کے لیے بڑے بڑے خواب ہوتے ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے سرگرم رہتے ہیں اسی طرح ہمایوں بخت کی زندگی کے حوالے سے ان کے ماں باپ کے دیکھے گئے بڑے بڑے خواب تھے۔ ہمایوں کی زندگی کی کایا ہی پلٹ گئی جب کسی وجہ سے اس کے باپ کی نوکری چلی گئی کچھ عرصے بعد ماں مر گئی اور بعد ازاں باپ بھی کہیں گم ہو گیا۔ جس وجہ سے ہمایوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ

پڑے، اسے ایک بہاری کے ساتھ مشرقی پاکستان میں مہاجرین کے ہمراہ آنا پڑا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد ہمایوں اس ظالم دنیا کے رحم و کرم پر آ گیا، جو کسی غریب کی کبھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اس معصوم بچے پر کیا کیا ظلم نہ ڈھائے۔ اس کی پوری دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ اونچے طبقے کے بچوں کا جس طرح کا رہن سہن، قیمتی اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے، ان چیزوں کے لیے نچلے طبقے کے بچے ترستے رہتے ہیں۔ معاشرے کے اندر وسائل کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے معاشرہ دو طبقات میں بٹا رہتا ہے اور احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔:

> میرے مالکوں کا لہجہ نہایت تلخ اور تحکمانہ ہوتا تھا۔ اور یہ خیال کہ میں ان کا غلام ہوں یہ میرے آقا، میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ میں کسی کی غلامی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر حالات اتنے خراب تھے کہ میں بالکل مجبور تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ان سب باتوں کے باوجود یہاں مجھے کوئی پڑھا دیا کرے تو میں یہ بھی برداشت کر لوں گا۔ میں نے یہ بات کہی تو سب نے میرا خوب مذاق اڑایا۔۲۸

طبقات کی جنگ کی وجہ سے معاشرے میں موجود ہر شخص کو ان مظالم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس چکی میں ہر ایک پستا ہے، ہمایوں کو اتنی چھوٹی عمر میں ان سب چیزوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ماں باپ کے جانے کے بعد اسے اس دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا جو اس کے ساتھ برا سلوک کر رہی تھی۔ اُسے حقیر سمجھا جا رہا تھا جیسے اس کا تعلق ان جیسے انسانوں سے نہ ہو۔ اُسے اس طرح احساس دلایا جا رہا تھا جیسے اس کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کی نہ ہو۔

> میری ذہنی کیفیت عجیب ہوتی جا رہی تھی اور تنگ آ کر میں نے وہ نوکری چھوڑ دی، میں بنیادی طور پر کسی کی غلامی نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر کیا کام تھا جو میں نے نہیں کرنا چاہا۔ جوتوں کی پالش، لیکن اس کے لیے سامان کہاں سے لاتا اتنے پیسے ہی نہیں تھے۔ اخبار بیچنا چاہا تو اس کے لیے کوئی گارنٹی دینے والا نہیں ملا۔۔۔ وقت اور حالات نے مجھے اتنی سی عمر میں بہت تجربے کار بنا دیا تھا۔۲۹

بورژوای طبقہ ہمیشہ سے پرولتاریوں کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے۔ ان کے ذریعہ معاش کے ساتھ ساتھ ان کی زندگیوں پر بھی تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ صاحبان مسند ان کا استحصال کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہمایوں کے کردار کے اندر پرولتاریوں کی زندگی کی عکاسی ملتی ہے کہ بورژوائی کس طرح ان کا استحصال کرتے ہیں ان کی خوشی

ان کی محنت کوئی چیز ان سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ ہر چیز میں ان کے لیے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مسائل پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ وہ کبھی ان کے مقابلے میں نہ آسکیں کبھی ان کی برابری نہ کر سکیں۔ انھیں آگے بڑھنے سے ترقی کرنے سے ہمیشہ روک دیا جاتا ہے۔

"Take care of yourself" افسانے کے کا مرکزی کردار والدین کا ہے۔ جو اپنی تمام جمع پونجی اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کر دیتے ہیں۔ انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ ان کے بچے کل کو ان کے بڑھاپے کا میں سہارا بنیں گے۔ لیکن جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی زندگی کے مقاصد بدل جاتے ہیں۔ پھر ان کے لیے ان کے ماں باپ کی سوچ، ان کا طرز زندگی ان سب کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ افسانے کے کرداروں کے اندر بھی کچھ ایسی ہی چیزیں موجود ہیں۔ ان کے ماں باپ نے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اس کے بعد وہ امریکا میں ہی اپنے خاندانوں کے ساتھ رہنے لگے۔ ان کے جانے کے بعد دونوں میاں بیوی "فلک نما" کے اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔ بیٹا شروع شروع میں باقاعدگی کے ساتھ خط لکھا کرتا تھا اور اس کی ماں کو اس کے خطوں کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔ ڈاکیا کی دستک پر وہ لپکتی ہوئی دروازے پر جاتی تھی، اس کی آنکھوں میں ایک چمک ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا بیٹے کے خط کی بجائے وہ خود اس کے سامنے کھڑا ہے:

> میں اسے خط پڑھ کر سناتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر ہزاروں دعائیں دیتی تھی۔ کبھی روتی اور کبھی ہنستی ۔۔ ہر خط میں یہ تسلی ضرور ہوتی تھی کہ ابھی مصروفیت بہت ہے جوں ہی فرصت ملے گی آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔ جب تک دوسرا خط نہ آجاتا تھا مجھ سے پرانا خط پڑھوا پڑھوا کر سنتی رہتی تھی۔۔ اور تھوڑے تھوڑے دن میں پوچھتی، "آپ نے جواب لکھ دیا یا نہیں؟ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ سب لکھا؟"[۳۰]

اس مصروف دنیا میں جب انسان مادیت کے پیچھے بھاگ، رہا ہے ایسے میں اس کے لیے رشتوں سے زیادہ مادیت کی اہمیت ہو۔ ان کا بیٹا پہلے تو باقاعدگی سے خط لکھتا تھا، اپنے ماں باپ کے حالات و واقعات سے غافل نہیں تھا۔ لیکن امریکہ جیسی مصروف زندگی کے اندر اس کی مصرفیات بڑھتی گئیں اور اس کو خط لکھنا بوجھ لگنے لگا تو اس نے ماں باپ کو ٹیلیفون لگوانے کا کہا کہ اس طرح وقت کی بچت ہو جائے گی۔ ماں کی محبت جو کبھی بھی کسی صورت عمر کے کسی حصے میں بھی میں اپنے بچوں کے لیے کم نہیں ہوتی، چاہے بچے جیسے بھی ہوں ماں باپ ہی ہیں جو اپنی اولاد کی خاطر نہ صرف

ہر طرح کی تکلیف دکھ اور مشقت کو برداشت کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بچوں کی نظر میں ماں باپ کو بڑھاپے میں صرف پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ماں باپ کے لیے بچوں کی خوشی، ان کی اہمیت ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنا ان کی خوشیوں میں شامل ہونے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ جب بچے اپنی مصروف زندگی کی وجہ سے وقت نہیں دے پاتے تو ایسے میں ماں باپ ان کی کامیابیوں سے اپنی خوشیوں کو وابستہ کر لیتے ہیں، تاکہ وہ خود کو مصروف رکھ سکیں:

> زمین کے اس فاصلوں نے دلوں کے فاصلے بھی بڑھا دیے۔ گفتگو مختصر سے مختصر ہوتی چلی گئی۔ اب چار چھ ماہ بعد ایک فون آجاتا تھا۔ بیٹا بہت جلدی میں ہوتا تھا۔ اور صرف یہی کہتا، "ابا، ماں! Take care of yourself"۔۔ دل کے اس فاصلے کے ساتھ ساتھ ان کی ماں پلنگ سے لگتی چلی گئی۔ اس کے جسم کی طاقت ختم ہوتی گئی۔ اس کی آنکھوں میں نور کم ہوتا گیا۔ کیوں کہ اس کی آنکھوں کا نور تو سمندر پار جا بسا تھا۔ ۳۱

اس معاشرے کے اندر سب سے بڑی حقیقت مادہ کی ہے۔ جس کے پاس مادہ موجود ہے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ انسان اپنی محنت کی بدولت جدید تر سہولیات حاصل ہو گئی ہیں، وہ دن رات ترقی کی منازل تو طے کر رہا ہے لیکن پستی میں جا پہنچا ہے۔ کیوں کہ وہ اخلاقی اقدار کی کراوٹ کا شکار ہے۔ اس کے پاس اپنے قریبی رشتوں کی اہمیت نہیں رہی وہ مادہ پرستی کی دوڑ میں سب بھول چکا ہے۔ افسانے میں اس کی ماں اپنے بیٹے کی یاد کی وجہ سے پلنگ سے جا لگی ہے، اس کی آنکھوں کی بینائی نہیں رہتی۔ مگر پھر بھی وہ اپنے ماں باپ سے ملنے نہیں آتا ہے کیوں کے اس کے پاس مر ایکہ جیسے ملک کی رنگینوں سے فرصت ہی نہیں ملتی، اس کے ماں باپ بس اس کی یادوں میں ہی گھل رہے ہیں:

> اچانک پورا فلیٹ آوازوں سے بھر جاتا ہے۔ لگتا ہے چھتیں، دیواریں، دروازے، کھڑکیاں، پلنگ، کرسیاں، برتن سب مل کر چیخ رہے ہیں۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے، "Take care، Take care" میرے کان پھٹنے لگتے ہیں۔ مجھے چکر آنے لگتے ہیں اور لگتا ہے میری ایک ایک نس چیخ جائے گی۔ مجھے قے ہو جائے گی۔ میرے اندر سے سب کچھ باہر آجائے گا۔ میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہوں۔ لیکن آوازیں اونچی ہوتی جاتی ہیں۔ "Take care، Take care" ۳۲

اس افسانے کے کرداروں کے اندر اتنی بے حسی دیکھی جاسکتی ہے۔ بچوں کی مصروف زندگی میں والدین کے لیے کوئی گنجائش نہیں بچتی مادہ پرستی نے پورے معاشرے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے انسان ہر چیز میں مادی مفاد کو سامنے رکھتا ہے چاہے وہ انسانی رشتوں اور اخلاقی قدروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

"میں پھول چننے آئی تھی" افسانے کے کرداروں میں مرکزی کردار چھوٹی بچی کا ہے جو اپنی ماں کے ساتھ گلیوں میں کاغذ چننے کا کام کرتی ہے۔ ان کے گھر میں ان دونوں کے علاوہ ان کا باپ اور ایک طلاق شدہ پھوپھی بھی رہتے تھے۔ اس کے باپ کا کردار بے کار انسان کا ہے جو نہ تو کوئی مزدوری کرتا ہے اور نہ ہی کوئی گھر کا کام کرتا ہے۔ گھر کا واحد فرد اس کی بیوی جو کما کر لاتی تھی اس کی عزت کرنے کے بجائے وہ اور اس کی بہن دونوں اس کے جانی دشمن بنے رہتے تھے۔ اس کی پھوپھی کا کردار ایک ظلم نند کا تھا جو ہر وقت اپنی بھاوج سے لڑتی تھی، اپنی محرومیوں کا بدلہ اس سے لیتی تھی۔ جو وقت بچتا تھا اس میں اپنے بھائی کے کان بھرتی رہتی تھی۔ بھاوج تو بھاوج وہ اپنی اکلوتی بھتیجی کو بھی نہ بخشتی تھی اس کے ساتھ بھی ظالمانہ رویہ تھا کہ وہ پورا دن گالیوں کا نشانہ بناتی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا گھر میں ایک چھوٹی بچی تھی اُس کے لاڈ نخرے اٹھائے جاتے لیکن اس کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا:

> میں اپنے باپ سے بھی اتنا نہیں ڈرتی تھی جتنا اپنی پھوپھی سے۔ عجیب بات تھی کہ پھوپھی اپنے بے کار بھائی کو ڈانٹنے کے بجائے اس بھاوج کی جانی دشمن تھی جو محنت مزدوری کر کے پورے گھر کا خرچ اٹھا رہی تھی اور جتنی دیر گھر میں رہتی تھی گھر کے کام، میاں کی خدمت اور نند کی ناز برداری میں گزارتی تھی۔ میں نے اپنی ماں کو کبھی منہ سے بولتے نہ دیکھا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ یا تو وہ گونگی ہے یا اس کی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے۔ ۳۳

اس کی ماں کا کردار سب سے زیادہ گھر میں قابل رحم تھا۔ مگر کوئی اس پر رحم کھانے کو تیار نہ تھا۔ وہ پورا دن گھر کے کام کرنے کے ساتھ ساتھ باہر کے کام بھی کرتی تھی۔ اپنے شوہر نند کی خدمت کرتی تھی اس سب کے باوجود اس کی اس کے گھر میں قبولیت نہیں تھی۔ جب تک وہ کام کرتے رہیں گے ان کا پیٹ پلتا رہے گا۔ اگر وہ کام کرنا چھوڑ دے گی تو ان کو کچھ بھی کھانے کے لیے نہیں ملے گا۔ وہ ایک دوسرے کو بغیر روزگار کے قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کا تعلق نچلے طبقے سے تھا جہاں ایک وقت کی روٹی مل جانا کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ وہ انتہائی خستہ حالی میں زندگی گزار رہے تھے:

ہمارا گھر کھارادر میں تھا۔ اسے گھر کہنا بھی گھر کی توہین تھی۔ وہ ایک نہایت پرانی خستہ حال بلڈنگ کا چھوٹا سا تنگ و تاریک کمرہ تھا۔ گراونڈ فلور پر ہونے کی وجہ سے دھوپ اور روشنی کا اس میں دور دور تک گزر نہیں تھا۔ اسی ایک کوٹھری میں سونا جاگنا، پکنا ریندھنا، اٹھنا بیٹھنا سب ہی کچھ ہوتا تھا۔ ماں جب چولھا جلاتی تھی تو گیلی لکڑیوں سے نکلتا ہوا دھواں سارے گھر میں بھر جاتا تھا اور کوٹھری میں موجود سارے آدمیوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے تھے اور وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو جاتے تھے۔ ۳۴

نچلے طبقے کو اگر دو وقت کی روٹی میسر آجائے تو پھر تن ڈاپنے کے لیے کپڑا میسر نہیں ہوتا۔ اگر کپڑا مل جائے تو سر ڈھانپنے کے لیے چھت نہیں رہتی۔ بچوں کے پڑنے کے مسائل الگ ہوتے ہیں ان کی زندگی انتہائی مشکل حالات میں گزرتی ہیں۔ پھر معاشرے کا ان کے ساتھ کیا جانے والا سلوک وہ اور بھی قابل رحم ہوتا ہے لیکن پھر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔ حمراء خلیق طبقاتی تقسیم کے بارے میں کہتی ہیں۔

میری نظریاتی دلچسپی ہی سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے میری آپ بیتی پڑھی اس میں میری زندگی کتنی شان و شوکت سے گزری۔ جب مجھے سمجھ آنا شروع ہوئی تو ان لوگوں سے زیادہ قریب ہوتی چلی گی جو مصیبتوں سے گزرتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں مصیبتوں سے گزری تھی بلکہ میں کسی کو ناانصافی کرتا دیکھوں تو مجھے سے برداشت نہیں ہوتا۔ اسے جب ظاہر ہے کچھ کہہ نہیں سکتی but I feel it that میرا دل ایسی تکلیف والی چیزوں سے پریشان ہوتا ہے۔ جب میں لکھنے بیٹھتی ہوں تو شان و شوکت والوں کا خیال کم آتا ہے اور متوسط طبقے کا زیادہ آتا ہے۔ ۳۵

افسانے میں اس طبقے کی حسرتوں کو چھوٹی بچی کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ جب وہ اردو بازار سے گزرتی تھی تو کس طرح وہ حسرت بھرئی نگاہوں سے اپنی جیسی بچیوں کو کتابیں، کاپیاں، رنگین پینسلیں اور نہ جانے کیا کیا خریدتے دیکھتی تھی۔ وہ ان سب چیزوں کا بڑی غور سے مشاہدہ کرتی تھی ایسے جیسے وہ سب کسی اور دنیا کی چیزیں ہوں کوئی اور خلائی مخلوق انھیں استعمال کرتی ہو:

میں سوچا کرتی، "کیا میں ان لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں؟ کیا مجھے یہ سب کچھ نہیں مل سکتا؟ آخر یہ لڑکیاں ان کا کیا کرتی ہیں؟ کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے؟" ۳۶

اس طبقے کے خواب ہمیشہ ادھورے ہی رہتے ہیں۔ ان کے بچوں کی حسرتیں ان کے خواب یہ سب کچھ پورا ہونا مشکل سی بات ہوتی ہے وہ کیسے اونچے طبقے کی برابری کر سکتے ہیں جب کہ وہ ان کے برابر کے نہیں ہیں۔ وہ بچی تھی اسے دنیا کی تقسیم کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا یہ سب چیزیں اس کے لیے عام نہیں ہیں۔ اُسے سکول کے اندر سے آتی ہوئی بچیوں کی پڑھنے کی آوازیں اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ کسی طرح اندر گھس جائے اور دیکھے اندر کیا ہو رہا ہے۔ مگر اسے کیا معلوم اس کی یہ خواہشات کبھی نہ پوری ہونے والی ہیں۔ وہ اپنی یہ حسرتیں لیے قبر میں چلے جاتے ہیں:

> ہم دونوں کو ان گلیوں میں خاک چھانتے چھانتے سالوں بیت گئے۔ میں جوانی کی حدود میں داخل ہونے لگی اور ماں جھک جھک کر کاغذ چنتے چنتے بالکل جھک گئی۔ لیکن ہماری زندگیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس تمام عرصے میں ہمیں کبھی دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا اور نہ ہمارے پھٹے پیوند لگے کپڑوں کی شکل بدلی۔[۳۷]

افسانے میں ان دو کرداروں کے ذریعے دونوں طبقات کے اندر پایا جانے والا فرق دونوں طبقات کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا کہ اس بچی کا حسرت بھری نگاہوں سے بورژوائی طبقے کو دیکھنا اور اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنا۔ دراصل اس معاشرے کے مقدر میں ہے اس کا تعلق پرولتاریوں سے تھا اس لیے اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لینن نے پرولتاری تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> پرولتاری تہذیب ایسی چیز نہیں ہے جو آسمان سے ٹپک پڑی ہو یہ ان لوگوں کی ایجاد بھی نہیں ہے کو اپنے آپ کو پرولتاری تہذیب کے ماہر سمجھتے ہیں اس قسم کی باتیں مہمل ہیں پرولتاری تہذیب کو اس تمام علمی خزانے کے فطری ارتقا کا نتیجہ ہونا چاہیے جس کو انسانیت نے سرمایہ داری، جاگیرداری اور غلامی کے دور میں جمع کیا ہے، یہ تمام راستے پرولتاری تہذیب کی طرف رہنمائی کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔[۳۸]

وہ اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی بلڈنگ میں موجود ایک پرائمری کی استانی کے پاس کاغذ لے کر پڑھنے چلی جاتی تھی۔ اس کے خوابوں میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور وہ سوچنے لگی وہ جلد ہی استانی بن جائے گی اور اپنا ہی مدرسہ کھول کر اپنے جیسی مجبور، غریب اور مصیبت زدہ بچیوں کو تعلیم دے گی۔ وہ اپنی خواہشات کو جلد ہی پورا ہوتا دیکھ رہی

تھی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی ماں دن بدن بیمار ہوتی جا رہی تھی اور وہ کام پر جانے سے بھی ناغے کر رہی تھی۔ جس کی وجہ سے گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ جب اس کی ماں نے اسے اپنی جگہ کام پر جانے کے لیے کہا تو اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایسا کیسے ممکن تھا وہ بھی اپنی ماں کی طرح دن بھر ذلیل ہو، وہ تو استانی بننے کے خواب دیکھ رہی تھی:

لیکن جب تک تو استانی بنے گی ہم بھوک سے مر چکے ہوں گے۔ کیا تو بھوکی رہ کر پڑھ لے گی؟ جا اٹھ وہ کونے سے بوری لے لے۔ ۳۹

اس کے لیے اپنے خوابوں کی دنیا سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے اپنی حیثیت کو قبول کرنا مشکل ہو رہا تھا وہ کیسے اپنے والدین والی زندگی گزار سکتی تھی۔ اسے ان سب کی قسمت کو بدلنا تھا، یہ سب تب ہی ممکن ہو سکتا تھا جب وہ پڑھے گی۔ لیکن ہمارے معاشرے کے اندر تعلیمی نظام بھی تین طبقات کے اندر بٹا ہوا ہے۔ جس طبقے سے اس کا تعلق تھا وہ صرف مزدور ہی بن سکتے تھے۔ بڑی بڑی نوکریاں ان کے نصیب میں کہاں ہو سکتی تھیں وہ تو صرف ان کے خواب ہی دیکھ سکتے تھے:

"مگر تجھے جانا پڑے گا۔ کیا تجھے پسند ہے اور کیا نہیں، بھوک یہ نہیں دیکھتی۔۔۔ ہم غریب ہیں مجبور ہیں۔۔ یہ سب پیسے والوں کے چونچلے ہیں۔" ۴۰

نچلے طبقے کی بھی خواہشات ہوتی ہیں ان کے بھی اپنے بچوں کے لیے ارمان ہوتے ہیں ان کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے کسی عہدے پر پہنچ سکیں۔ پرولتاریہ صرف دو وقت کی روٹی کو پورا کرنے کے خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ بورژوائی کی طرح ان کی زندگیاں کوئی شان و شوکت میں نہیں گزری ہوتیں جن میں ان کے خواب، عیش و عشرت کی زندگی کے ہوں جب سونے کے لیے بستر، رہنے کے لیے چھت، پہننے کے لیے کپڑا، کھانے کے لیے روٹی میسر نہ ہو تو خواب صرف دو وقت کی روٹی تک ہی محدود ہوتے ہیں۔

"دیکھ کبیر ارویا" افسانے کا مرکزی کردار جامو نامی ایک نوجوان کا ہے جو ایک ہسپتال میں بحیثیت اسٹریچر بردار ملازم ہے۔ دوسرا کردار اس کی بیوی گل جان کا تھا جو معصوم محبت کرنے والی گھریلو خاتون تھی۔ جامو کا کردار حساس محبت کرنے والا، ہر ایک کے کام آنے والے، رحم دل انسان کا تھا۔ وہ ہر ایک کے درد کو اپنا درد سمجھ کر شریک ہوتا تھا۔

معاشرے میں اس کی کوئی شناخت نہیں، اتنی محنت کے باوجود کوئی اُسے اپنی برابری دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ہر وقت ہر موقعے پر حاضر رہتا تھا، چاہیے اس کی ڈیوٹی ہو یا نہ ہو۔ سب اس کو بے وقوف سمجھتے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے، ان کے اندر انسانیت نام کی چیز ختم ہو گئی تھی اس لیے جامو کا رویہ ان کے لیے عجیب تھا:

> ان سب کے لیے تو یہ ایک معمول تھا، کسی کی چوٹ، کسی کا زخم، کسی کی دل ہلا دینے والی چیخیں، ان سب پر کچھ اثر نہیں کرتی تھیں۔ وہ تو اسٹریچر پر پڑے ہوئے مریض کو ایسے گھسیٹتے ہوئے لاتے لے جاتے تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بے جان چیز ہے۔ آپریشن تھیٹر سے نکلے ہوئے مریض سے جس کے تازہ تازہ ٹانکے لگے ہوئے ہوتے یہ سب ایسے کھینچ تان کرتے کہ جامو کا دل حلق میں آجاتا۔[۱۴]

اس کا کردار اتنے رحم دل انسان کا تھا کہ اگر کسی کا کوئی مر جاتا تو وہ اس کے رشتہ داروں کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر روتا رہتا تھا۔ ہسپتال کے ایک طرف بنی ہوئی جھگیوں میں رہتا تھا۔ ان جھگیوں میں اس جیسے اور بہت سے لوگ رہتے تھے جیسے گھوڑا گاڑی والا، روئی دھنکنے والا، ایک نان بائی جامو کی ان سب سے اچھی دوستی تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کے مشکل وقت میں کام آتے تھے۔ جب جامو کی ماں کا شادی کے لیے اسرار بڑھ گیا تو سب نے جامو کی بہت مدد کی اس کے گھر کو سجایا۔ جھونپڑی کی صفائی کی۔ رنگ برنگے کاغذوں سے جھنڈیاں کاٹ کاٹ کر جھالریں لٹکائیں۔ نچلے طبقے کی بھی خوشیاں ماننے کا الگ انداز ہوتا ہے۔۔ ان لوگوں کی بھی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں جن کو مناتے ہیں، جن کے سہارے جیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے، کہ اونچے طبقے کا خوشی منانے کا انداز الگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے لاکھوں، کروڑوں اپنی خواہشوں پر خرچ کرتے ہیں جبکہ نچلا طبقہ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھ کر خوشاں مناتا ہے۔ وہ بھی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو جتنا ممکن ہو سکتا ہے ماننے کی کوشش کرتے ہیں۔ جامو کی بیوی بہت اچھی نیک سیرت ہر ایک کا خیال رکھنے والی تھی۔ افسانے میں دو طبقات کی عکاسی ملتی ہے ایک طرف بڑا سا ہسپتال اس کے ارد گرد رہنے والے امیر باسی جن کی اونچی اونچی خواہشات، دوسری طرف جھگیوں میں رہنے والا غریب طبقہ جس کے باسی جامو اور اس کی بیوی تھے جو دنیا کی ہر چیز سے بیگانہ ہو کر اپنی دنیا میں گم تھے:

> ان کی دنیا کتنی عجیب تھی، نہ عطر و عنبر کی خوش بو، نہ چنبیلی گلاب کے پھولوں کی مہک، نہ اطلس و کم خواب کے لباس، نہ حریر و دیبا کے ریشمی ملائم کپڑے، مگر وہ دونوں کس قدر خوش تھے، جامو

کو تو جیسے جہان بھر کی دولت مل گئی تھی۔ اسے اب کسی چیز کی تمنا نہیں تھی، گل جان اس کی
دولت تھی اور گل جان بھی جامو کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھی، مادی دولت نہیں تھی تو کیا تھا محبت کی
انمول دولت تو انھیں حاصل تھی۔ ۴۲

ان دو معصوم مکینوں کی دنیا ہی الگ تھی وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ جب جامو کو خبر ملی کہ وہ باپ بننے والا ہے تو اس کا خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ نچلے طبقے کے پاس خوشیاں ہی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ زندگی گزارتے ہیں۔ ل۔ احمد محبت کے بارے میں لکھتے ہیں:

محبت دنیا میں ہر چیز حتی کہ فاقے کا بھی نعم البدل ہے کیونکہ لمحات محبت کی یاد سے زیادہ حسین
خود محبت بھی نہیں ہے۔"۴۳

اس کے پاؤں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے اپنے ہسپتال میں اپنی بیوی کا نام لکھوا دیا اس کی خواہش تھی اس کی اولاد اس بڑے ہسپتال میں پیدا ہو جہاں وہ کام کر رہا تھا۔ جب کہ اس کے دوست کی بیوی نے اسے بہت سمجھایا کہ بڑے ہسپتال اور بڑے ڈاکٹروں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ نہ جانے کب ان کا دماغ خراب ہو جائے۔ تو تم اسے کسی چھوٹے ہسپتال میں لے جاؤ لیکن اس کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ اس کا بچہ بڑے ہسپتال میں پیدا ہو گا۔ اس معصوم کو کیا خبر تھی کہ یہ معاشرہ اپنی برابری کرنے والوں کو کبھی قبول نہیں کرتا:

"ڈاکٹر صاحب وہ میری""ہاں، ہاں دیکھ لیں گے اسے بھی، تم دیر نہیں کرو، مریضہ کی حالت
ٹھیک نہیں ہے"ڈاکٹر صاحب میری بیوی"اوہ یو، ایڈیٹ"۴۴

اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ جس ہسپتال میں ہے وہاں ڈاکٹر نہیں بلکہ قصائی کام کرتے تھے۔ جن کے لیے انسانوں سے زیادہ پیسوں کی اہمیت تھی۔ وہ جوہر ایک کے کام آنے والا ہر ایک کی مدد کرنے والا اس کی ڈیوٹی ہو یا نہ ہو آج جب اسے ضرورت تھی تو کوئی اس کی مدد کو نہیں تھا۔ اس کے عہدے، اس کی حیثیت کی وجہ سے، حالانکہ وہ اپنی ڈیوٹی باقی سب کی طرح پوری ایمان داری سے نباہ رہا تھا۔ اپنے باقی عہدے داروں کی طرح چونکہ اس کا عہدہ اور اس کی حیثیت قابل قبول نہیں تھی اس لیے وہ اکیلا ہسپتال میں تڑپ رہا تھا، کوئی ایک ہو جو اس کی بیوی کی جان بچا سکے۔ وہاں سب مسز عظیم کی جان کو بچانے میں لگے تھے۔ کسی کو جامو کی ہوش کہاں تھی:

مبارک ہو مسٹر عظیم زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں" جاموتم جاسکتے ہو" وہ سب گھر آ گئے اور
اب وہ کئی گھنٹوں سے مسلسل گل جان کو دیکھ رہا تھا جو زرد اور سرخ چھینٹ کے ملگجے کپڑوں میں
اب بھی کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ "گل جان تو جیت گئی، تو نے بیٹا پیدا کر دیا۔ میں ہار گیا،
میری گل جان، میری نور جہاں، میری ملکہ سب کچھ ختم ہو گیا، کوئی کسی کا باپ ہے، کوئی کسی کے
ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک، کوئی کسی کا سہاگ۔ ۴۵

اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کوئی اس کے عہدے کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ بھی ان کی طرح اتنے ہی گھنٹے کام کرتا تھا۔ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر رہا ہوتا ہے۔ جس طرح باقی افسران کر رہے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا عہدہ قابل ستائش نہیں ہے اس لیے اس کی قبولیت نہیں ہے اس معاشرے کے اندر اس لیے وآخر میں وہ ایک ہارے ہوئے کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ گل جان کے مر جانے سے اس کی پوری دنیا ہی ختم ہو جاتی ہے۔

"کنگال" افسانے کے کرداروں میں مرکزی کردار نصیر بھیا کا ہے۔ ان کے علاوہ گھر میں ماں اور پانچ بہن بھائی تھے۔ جبکہ باپ کا کچھ عرصے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ باپ کے حادثے کے بعد وہ نوکری کی تلاش میں لگ گیا تھا۔ ان کی چند ہزار کی نوکری سے گھر میں ایک امید سی جاگ اٹھی۔ جس سے گھر والوں کا اچھا خاصہ گزر ہو جاتا تھا۔ جب بھی ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا تو وہ سب کے لیے تحائف لاتے تھے۔ جس سے سب بچے خوش ہو جاتے۔ امی اس فضول خرچی پر بناوٹی ڈانٹ پلاتی تھیں:

آخر اس پر میرے گھر والوں کا بھی حق ہے کوئی دیکھ نہیں رہی ہیں یہ سب بچے کس قدر خوش ہیں
اور پھر آپ تو میری ماں ہیں۔ میری جنت بھی تو آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔ آپ کی دعاؤں
سے ہی تو یہ نوکری ملی ہے۔ آپ دعائیں دیتی جائیں میں ترقی کرتا جاؤں گا۔ ۴۶

نصیر بھیا دن رات محنت کرنے کی وجہ سے ترقی کرتے جا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ آگے پڑھتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی ان کی نوکری اور تنخواہ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تنخواہ کے اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے تحائف میں بھی کمی آتی جا رہی تھی۔ سب نے حالات کی نزاکت کو سمجھ کر سمجھوتا کر لیا تھا۔ جیسے جیسے بھیا ترقی کر رہے تھے امی کو ان کی شادی کی فکر ہو رہی تھی۔ جب کہ بھیا کی ضد تھی کہ وہ ابھی شادی نہیں کریں گے۔ سب سے پہلے وہ اپنے بہن بھائیوں کی

ذمہ داریوں کو پورا کریں گے اس کے بعد ہی اپنی شادی کا سوچیں گے۔ امی نے انھیں شادی کے لیے راضی کر ہی لیا تھا۔ معاملات ان کی شادی کے بعد سے خراب ہونا شروع ہوئے۔ وہ باہر ملک جانا چاہتے تھے:

> امی تو بے حد اداس ہو گئیں۔ حالانکہ انھوں نے اس کا بالکل اظہار نہیں کیا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ وہ بھیا کو جس قدر چاہتی تھیں ان کے بغیر رہنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ بھیا تسلی دیتے رہے ،"سعودی عرب بہت دور نہیں ہے۔ دو تین گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ ہم آتے رہیں گے۔ آپ سب بھی آسکتے ہیں۔ دیکھیے نا اخراجات بڑھ رہے ہیں۔۔ ناہید کی شادی بھی کرنا ہے۔[۴۷]

افسانے میں کرداروں کا رویہ ان کی معاشی حیثیت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ شروع میں وہ حادثے اس حادثہ سے دو چار ہوا تھا اس لیے وہ اپنے بہن بھائیوں کا خیال رکھ رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا وہ اس ذہنی کیفیت سے باہر آجاتا ہے اور ان مسائل سے نکل کر دور کسی اور ملک میں چلا جاتا ہے تو یہ سب کیفیات اس کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہن بھائیوں کے حقوق و فرائض بھی اس کے ذہن سے نکلتے جاتے ہیں:

> دو تین سال گزر گئے فون، خط اور پیسوں میں کمی آتی گئی۔[۴۸]

جب اس کے پاس پیسا زیادہ ہو جاتا ہے تو اس کے ذہن سے ان بہن بھائیوں کا خیال نکل جاتا ہے۔ مادیت میں گم ہو کر اسے پہلے والے مسائل، مسائل لگتے ہی نہیں ہیں۔ اس لیے وہ اپنے گھر والوں کو بھولنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کے کردار ماحول پر انحصار کر رہے ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ان کا ماحول بدلتا ہے ان کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ بھائی جو اپنے بہن بھائیوں کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہ رہا تھا وہ باہر جا کر سب بھول گیا تھا:

> امی نے بھیا کو تفصیلی خط لکھا، "مہنگائی بڑھ گئی ہے۔ ناہید شادی کے لائق ہو گئی ہے۔ میں بیمار رہنے لگی ہوں۔ ندیم کی تنخواہ میں گزر نہیں ہوتی۔ وہ ذمہ داریاں جو تم شادی سے پہلے پوری کرنا چاہتے تھے اور جن کے لیے تم شادی ٹالتے رہتے تھے اب انھیں تمھاری ضرورت ہے۔۔۔ جواب آیا، "امی میرے اخراجات بہت ہیں۔ منے کا خرچ، گھر کی ضرورتیں۔[۴۹]

جب تک وہ اس غربت کے ماحول میں زندگی گزارتے ہیں ان سب چیزوں کو سمجھتے ہیں وہ ماحول ان کی ذہنی کیفیات کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ ماحول بدلنے سے ان کا نظریہ معاش بدل جاتا ہے۔ انھیں نچلے طبقے کے مسائل سمجھ میں نہیں آتے۔ جیسے اونچے طبقہ کو نچلے طبقے کے مسائل کا ادرک نہیں ہوتا۔ جب وہ وہاں آکر رہتے ہیں ان کے درمیان زندگی

گزارتے ہیں تو انھیں ان مسائل کی سمجھ آتی ہے۔ لیکن جب وہ اس ماحول سے نکل جاتے ہیں تو ان کے لیے اس ماحول کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

> یہ بھی درست تھا کہ جب بھیا کو دو ہزار ملتے تھے تو وہ بہت امیر تھے۔ لیکن اب ایک لاکھ تنخواہ حاصل کرتے ہوئے وہ مالی اور جذباتی دونوں طور پر کنگال ہو چکے تھے۔ ۵۰

بھیا کی زندگی معاشی دوڑ میں لگ چکی تھی۔ ان کے لیے پیچھے دیکھنا مشکل تھا۔ اب ان کے لیے غریبوں کے لیے سوچنے کے لیے وقت نہ تھا۔ انھیں ہمارے مسائل کو سمجھنا مشکل لگ رہا تھا، کیوں کہ وہ اب پیسا کمانے کی دوڑ میں لگ جانے کی وجہ سے اپنے فرائض سے بھاگ رہے تھے۔

"چشم خون بستہ سے۔۔" افسانے میں اونچے طبقے اور نچلے طبقے کی آپس کی ترجیحات کی عکاسی کی گئی ہے۔ اونچا طبقہ اپنی شان و شوکت بڑھانے کے لیے اپنے پیسے کو مختلف چیزوں پر لگاتا رہے جس سے ان کی تعریف و ستائش ہو سکے۔ اس افسانے میں مصور نے ایک شاندار تخلیق بنائی تھی جس کو اپنی تخلیق کے شایان شان کوئی خریدار نہیں مل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کوئی شاندار خریدار اسے ملے جو اس کی تخلیق کی قدر کر سکے:

> یہ تخلیق اس کی ذات کا حصہ تھی۔ یہ وہ خود تھا اور کوئی خود کو اتنی آسانی سے نہیں بیچتا۔ اس کو فروخت کرنے کے لیے کسی مناسب ترین گاہک کا ہونا ضروری تھا۔ ۵۱

افسانے میں ایک کردار ایک دن وہ تخلیق خریدنے کے لیے آیا اور اس نے اُسے لالچ دے کر خود کو اس کا بہت بڑا قدر دان ظاہر کیا۔ اور اس سے وہ تخلیق خرید لی جس سے اس کی شہرت پورے شہر میں پھیل گئی۔ اور یہ عزت اور شہرت اسے پیسے کی وجہ سے ہی مل رہی تھی۔ جبکہ کوئی غریب اس سستی شہرت کی گنجائش بھی نہیں نکال سکتا یہ سب اونچے طبقے کے ہی چونچلے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی ثقافتی، تہذیبی اور اخلاقی پس منظر نہیں بلکہ وہ کم ظرف انسان تھا۔ جو اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی وجہ سے گھٹیا پن کا مظاہر کرنے لگتا ہے:

> وہ صحیح معنوں میں فن کا دل دادہ بھی نہیں تھا اور اس کی اصلیت جلد ہی دنیا کے سامنے ہونے لگی۔۔ اس کے انداز میں، اس کے رویے میں، اس کی حرکات و سکنات میں ایک چھچھورا پن اور گھٹیا پن نظر آنے لگا تھا۔ وہ اپنے گھٹیا پن کا مظاہرہ بعض مرتبہ نہایت بھونڈے پن سے کرتا، مثلاً

جب سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ تخلیق کار آتے جاتے اکثر اپنی تخلیق کو دیکھ لیتا ہے تو وہ اسے کبھی کھڑکی کے پٹ کے پیچھے، کبھی پردے کے پیچھے اور کبھی کسی ایسی جگہ چھپا دیا کرتا جہاں اس پر اس کی نظر نہ پڑ سکے۔ ۵۲

اس کے اندر ایک کم ظرفی پائی جا رہی تھی۔ اس کی اہمیت دنیا کے سامنے اس لیے زیادہ ہوئی کہ وہ امیر بندہ تھا۔ کیوں کہ کوئی بھی فن پارہ ہو کسی کی کوئی بھی تخلیق ہو اس کی قدر و منزلت پیسے و دولت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے ارد گرد کے لوگوں میں متعارف ہوتا ہے وہ بندہ امیر ہے اس کے آس پاس کے اس کے گروہ کے لوگ بھی امیر ہیں تو اس چیز کی قدر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اگر یہی چیز کسی نچلے طبقہ کے پاس ہو تو اس کو اس طرح کی پذرائی نہیں ملتی۔ چاہے وہ کتنی بھی قیمتی کیوں نہ ہو اس کی اہمیت کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اس کردار کے اندر سے احساس کمتری نہیں جاتا، جس سے وہ خود کو بہت کمزور محسوس کرتا ہے اور کم ظرفی کا مظاہرہ کرتا ہے:

اس کے پاؤں بندشوں کی تمام زنجیروں کو توڑ کر خریدار کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ بہت دیر تک وہ اپنی مخصوص جگہ کھڑا ہو کر اپنی تخلیق کو تلاش کرتا رہا۔ لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے ہر ممکنہ جگہ اسے تلاش کیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کہاں ہے وہ؟ کیا کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا ہاتھ؟ یا خدا نخواستہ؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی سانس رک گئی۔ اس کا دل سائیں سائیں کرنے لگا۔ یہ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں۔ وہ قریب ہوتا گیا۔ قریب اور قریب۔۔۔ یہ کیا؟ اس کی تخلیق نہایت لاپروائی سے مٹی سے اٹی ہوئی ایک کونے میں رکھی تھی۔ ۵۳

اس افسانے کے کرداروں کے اندر احساس تفاخر پایا جاتا ہے، جس میں یہ ایک دوسرے کو اپنے پیسوں کی وجہ سے نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی تصویر تو خرید لیتا ہے لیکن اس کے اندر سے یہ حسد ختم نہیں ہوتا کے یہ تخلیق اس کے شکار ہاتھوں کی تخلیق نہیں ہے۔ دوسرا کردار اس پچھتاوے میں زندگی گزارتا ہے، اس سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہوئی ایک کم ظرف انسان کو پہچانے میں۔

"کچوری والا" افسانے کے کرداروں میں نچلے طبقہ کی عکاسی ملتی ہے۔ وہ کس طرح محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کو اعلیٰ مقام تک پہنچانے کی کوشش کرتے اور اُس کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ اس کے کرداروں میں مرکزی کردار کچوری والا کا ہے جس نے پوری زندگی کچوری بیچ کر اپنی بچیوں کو تعلیم دی، ان کے بہتر مستقبل کے لیے دن

رات محنت کی تین چار جگہوں پر کام کیا پھر جا کر کہیں ان کے خوابوں کی تکمیل ہو سکی۔ وہ ایک اسکول کے سامنے کچوریاں بیچتا تھا، اس اسکول میں بچیوں کو پڑھتا دیکھ کر اس کا بھی دل کرتا تھا کہ اس کی بچیاں بھی ان کی طرح پڑھیں اور نام روشن کرے۔ جب ان کے اسکول میں داخلے کا مسئلہ درپیش آیا جس کے لیے اسے مدد کی ضرورت تھی اور اس نے اس اسکول کے چپراسی سے بات کی:

> شاید اُس نے اپنی حیثیت اور بساط سے بڑھ کر فرمائش کر دی ہے۔ اس کے دل کو چوٹ سی لگی۔ واقعی اس نے غلطی کی تھی۔ اس جیسے مزدور، کم حیثیت اور ازل سے جاہل گنوار انسانوں کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اتنے بڑے بڑے اسکولوں میں پڑھانے کے بارے میں سوچیں۔ یہ ادارے تو اعلیٰ طبقے اور پیسے والے لوگوں کے بچوں کے لیے بنائے گئے ہیں، لیکن کیا یہ سرکاری اسکولز بھی ایک غریب شخص کی اولاد کو اس بات کا حق نہیں دے سکتے کہ وہ بھی تعلیم حاصل کر سکے، اور اپنی غربت اور جہالت کی زندگی سے نکل کر ایک بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔ وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ ۵۴

معاشرے میں لوگوں کا رویہ نچلے طبقے کے ساتھ ہمیشہ سے برا رہا ہے کبھی انھیں اس چیز کا حق نہیں دیا جاتا کہ وہ ان کی برابری کر سکیں اور ان کے مقابلے میں آنے کی کوشش کریں۔ اگر کبھی وہ ان کی برابری میں آنے کے بارے میں سوچے تو ان کے ساتھ ہونے والا سلوک بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کچوری والا کی اسکول کے چپراسی نے بہت مدد کی اور اس کی بچیوں کا داخلہ ہو گیا۔ وہ بہت خوش تھا اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا اس کی ساری خواہشات پوری ہو گئی ہیں۔ پھر اسے ان کے پیش آنے والے اخراجات کی فکر لگ جاتی وہ کیسے پورے ہوں گے۔ اب اسے اور محنت کرنا پڑے گی۔ اس نے بچیوں کو سکول بھیجتے وقت کچھ چیزیں سمجھائی:

> وہ دو دن تک انھیں یہ بھی سمجھاتا رہا کہ دل لگا کر پڑھنا، مجھے شرمندہ نہ کرنا، اسکول میں تمیز سے رہنا، کسی سے لڑائی نہ کرنا، اور سب سے اہم بات یہ کہ تمہارا باپ کچوریاں بیچتا ہے۔ بچیاں تمھیں چھیڑیں گی، مذاق اڑائیں گی، لیکن اس پر شرمندہ نہ ہونا۔ نہ اُن سے بحث کرنا، بلکہ یہ سوچنا کہ یہ تو فخر کی بات ہے کہ ایک کچوری بیچنے والے کی بیٹیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ۵۵

اس افسانے کے کرداروں کے اندر بار بار مایوسی کی کیفیت جنم لیتی ہے، کیوں کہ معاشرہ پوری زندگی ان کے ساتھ ایسا رویہ دکھا جاتا ہوتا ہے کہ انھیں پوری زندگی احساس کمتری محسوس ہوتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کردار مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں لوگوں سے مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ اونچے طبقے کا سلوک ہی اس طرح کا ہوتا ہے جس سے وہ ان کی برابری کا خیال ہی ذہن سے نکال دیتے ہیں۔ کیوں کے ان کہ سر شروع سے کچل دیے جاتے ہیں جن میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں رہتی۔ اس طرح افسانہ میں کچوری والے کی بیوی کا یہی حال تھا:

> اس کی بیوی کبھی کبھی چڑ جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اور صفیہ شاید خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ خواب جو ان جیسے کم حیثیت، دن رات محنت کر کے دو وقت کی روٹی کمانے والے انسانوں کو نہیں دیکھنا چاہیں، کیوں کہ ان کے خواب کبھی پورے نہیں ہوسکتے، اور پھر ان خوابوں کے ٹوٹنے پر جو ان پر گزرے گی، اُسے وہ سہار نہیں سکیں گے۔۵۶

افسانے میں ماں کے کردار کے اندر مایوسی غالب نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ معاشرے میں موجود لوگوں کا ایسا رویہ تھا جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ کرداروں کے اندر محنت سے سب کچھ ممکن کر لینے کا حوصلہ موجود ہے اور انھوں نے کر دکھایا ہے جیسے کچوری والے کا کردار ہے جس نے آخری دم تک دو دو تین تین جگہوں پر کام کر کے اپنی بیٹی کا خواب پورا کیا۔ دوسری طرف صفیہ کا کردار تھا جس نے لوگوں کی پروا کیے بغیر دن رات محنت کر کے اپنے خوابوں کو تکمیل تک پہنچایا۔

"یتیم" افسانے کے کا مرکزی کردار ایک جدی پشتی رئیس کا ہے جس کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ لیکن اس کی اولاد نہیں تھی۔ لوگوں کی نظر میں وہ نہایت پر سکون، مطمئن اور عیش و آرام کی زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن کون جانے انھیں اولاد کی کمی کا کتنا غم تھا۔ ویسے بھی ہمارا معاشرہ بے اولاد لوگوں کا جینا حرام کر دیتا ہے۔ ایسے جوڑوں کو ڈر اور سہم کر زندگی گزارنی ہوتی ہے، وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں۔ اس خطرہ سے ہی دوچار رہتے ہیں کہ کوئی ان سے اولاد کے متعلق سوال نہ کرے، کوئی ان کی اولاد نہ ہونے کی وجہ نہ پوچھ لے۔ کوئی دنیا کا ایسا ڈاکٹر نہیں تھا جسے سے انھیں نے نہ دکھایا ہو۔ ان کی قسمت میں اولاد اللہ نے لکھی ہی نہیں تھی۔ پھر ان لوگوں نے یتیم خانے سے بچہ لانے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے انھوں نے قیمتی ملبوسات اور کھلونے لیے، اس کے لیے الگ کمرہ تیار کیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی کتابیں بھی خرید لی گئیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اسے سر پر بٹھالیں:

اس بچے نے ایک سونی گود بھر دی تھی۔ دو دلوں کی وہ آرزو پوری کی تھی جسے دنیا کی دولت پوری نہیں کر سکی تھی۔ ہر طرح کا عیش و آرام حاصل ہونے کے باوجود دل کا کھوکھلا پن جو انھیں اندر ہی اندر سنگسار کرتا رہتا تھا، اس ننھے وجود نے اس کو بھر دیا تھا۔ ننھی سی اس جان نے اُس اندھیرے کو مٹا دیا تھا جو لاکھوں بلبوں اور ہزاروں چراغوں کے باوجود دلوں کی تاریکی کو دور نہیں کر سکا تھا، تو ظاہر ہے وہ بچہ آنکھوں کا نور ہی تھا جس کا نام نور العین ہی ہو سکتا تھا۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گھر کی فضا ہی بدل گئی ہے۔۵۷

وہ بچہ ان کی آنکھوں کا نور اور دل کا چین تھا۔ اس کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی گئی، دنیا کی ہر خواہش اس کی زبان پر آنے سے پہلے پوری کی گئی۔ جب اس کی یونی ورسٹی کی تعلیم کا وقت آیا تو ان لوگوں نے اسے باہر کے ملک بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اسے فل برائٹ اسکالر شپ پر امریکہ کی بہترین یونی ورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ اتنی خواہشات، اتنے لاڈ پیار کے بعد اس بچے نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تکلیف دہ ہے۔ اس نے بے حسی کی انتہا کر اور انھیں کو بتائے بغیر اس نے امریکہ میں شادی کر کے وہاں کی شہریت حاصل کر لی اب وہ وہیں اپنا بزنس منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ ان ماں باپ کو جنھوں نے اُسے اس مقام تک پہنچایا ان کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ان کی قربانیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، وہ سب کچھ بیچ کر باہر ہی رہنا چاہ رہا تھا۔ ماں پر یہ خبر بجلی بن کر ٹوٹی وہ یہ برداشت نہیں کر سکی اور اس دنیا سے چلی گی باپ نے فون کر کے بلایا، سب کچھ بیٹے کے نام کرنے کے بعد وہ خود ایدھی سنٹر چلے گئے اور وہاں جا کر اسے پتہ چلا وہ ان کا بیٹا نہیں اسے یہاں سے لیا گیا تھا:

اس لیے بیٹا کہ جب تم بے سہارا تھے تو تم اس گھر میں تھے۔ لیکن آج میں بے سہارا ہو گیا ہوں تو میں یہاں آ گیا ہوں۔ آج یہ میرا گھر ہے۔۵۸

افسانے کے کرداروں کے اندر بے حسی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب کے عادی ہو جاتے ہیں اور اپنی اقدار کو فراموش کر دیتے ہیں جن ماں باپ نے اپنے بچوں سے بڑھ کر عزت و محبت دی کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی ہو ان کے ساتھ ایسا سلوک ان کے محبت و خلوص کی توہین ہوتی ہے۔ حمراء خلیق کے افسانوں کے بارے میں اظہار حیدر لکھتے ہیں:

> حمراء خلیق کے افسانوں میں پختگی، حقیقت نگاری اور زندگی کی کامیاب عکاسی ملتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انھیں زندگی کے بند پہلوؤں کا احساس ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زندگی میں صرف وہی باتیں نہیں ہوتی ہیں جو ہم چاہتے ہیں یا جنھیں ہم اچھا سمجھتے ہیں۔ تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا بھی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ ۵۹؎

ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں اس کے بھی مختلف معیارت ہیں۔ جس کے پاس جو چیز نہ ہو اس کا احساس اسے پر معاشرہ بار بار دلاتا ہے۔ ان کے پاس اولاد نہیں تھی جس پر پورا معاشرہ انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر رہا تھا۔ افراد معاشرہ ان سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے ان کی اس معاشرے میں کوئی جگہ ہی نہیں رہی بعد ازاں جب وہ اولاد کی بہت اچھی پرورش کرتے ہیں اپنا سب کچھ اس پر وار دیتے ہیں۔ آخر میں بچہ باہر کے ممالک کی اخلاقیات میں اتنا گم ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی میں ان کی جگہ ہی نہیں رہتی۔ اس کے پاس ان کے لیے وقت ہی نہیں رہتا ان کو دینے کے لیے وہ پیار محبت بھی نہیں ہے جو کبھی انھوں اسے دیا تھا۔ آخر میں اس کا باپ اس جگہ پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں سے کبھی اس نے بیٹے کو لیا تھا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حمراء خلیق کے افسانوں کے کردار اپنی زندگی میں مسلسل جدہ جہد اور کشمکش کی کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے کردار غربت کی چکی میں پستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ والدین کے لیے بچوں کو دووقت کی روٹی پوری کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مارکسی نظریے کے مطابق معاشرے کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ نچلے طبقے کی مشکلات کبھی کم نہیں ہوتیں۔ وہ پوری زندگی محنت مزدوری کرتے رہتے ہیں، اور ان کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی وہ جس حیثیت سے پیدا ہوئے ہوتے ہیں اُسی میں مر جاتے ہیں۔ کبھی حمراء خلیق کے کردار اپنی بھوک کو مٹانے کے لیے اپنی عزت تک کا سودا کر دیتے ہیں۔ معاشرے کے ایسے رویے کی وجہ سے اپنا جسم تک بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

ان کرداروں کے اندر بہت حساس رویہ پایا جاتا ہے۔ ان کی شرفت اور ان کی اچھائی کا لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے غم کو اپنا غم سمجھ کر شریک ہو جاتے ہیں، لیکن جب ان کی باری آتی ہے تو وہ خود کو ہمیشہ اکیلا ہی پاتے ہیں۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔

والدین اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہیں مگر معاشرے کی بے حسی اتنی بڑھ چکی ہے کہ بچے مادیت کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنے ماں باپ کے فرائض سے روگردانی کرنے لگتے ہیں ۔ ان کے لیے ماں باپ بوجھ بن جاتے ہیں جس وجہ سے وہ انھیں اکیلا چھوڑ کر خود اپنی زندگیوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔ حمراء خلیق نے ایسے موضوعات کو اپنے افسانوں کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے جو مارکسی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔ معاشرے کا اونچا طبقہ نچلے طبقے کے ساتھ ہمیشہ سے برا سلوک کرتا ہے، انھیں انسان تک تصور کرنے کا روادار نہیں ہوتا۔ ان کے بچوں تک سے ان کا رویہ اچھا نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ بھی یہ لوگ انسانوں کی طرح پیش نہیں آتے۔ نچلے طبقے کے بچے حسرتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور پھر انہی حسرتوں، امیدوں کو لیے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر معاشرے کا کوئی شخص اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے اوپر اگر مشکل وقت آجائے تو یہ معاشرہ اسے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان کی بے بسی جیسے انھیں سکون دلائی ہے۔

حمراء خلیق کے افسانوں کے کردار مارکسی حوالے سے ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ نچلے طبقے میں سے کوئی فرد جب اپنے بچوں کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے نکلتا ہے تو اس کے ساتھ غیر انسانی رویہ روا رکھا جاتا ہے جس سے وہ تنگ آکر اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ انھیں ہر بات میں طعنے دیے جاتے ہیں، ان کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے اور وہ قبول نہیں کر پا رہے ہوتے کہ کوئی ان کی برابری بھی کر سکتا ہے یا ان کے مدمقابل بھی کبھی آسکتے ہیں۔ ان کے بچوں کو دماغی طور پر مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ پوری زندگی احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. حمراء خلیق، چار کتابیں (کراچی: اشارات پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۷ء)، ص ۳۱۶۔

۲. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۲۔

۳. الضاً، ص ۱۲۔

۴. الضاً، ص ۱۴۔

۵. الضاً، ص ۱۵۔

۶. ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، جدید اردو افسانے کے رجحانات (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۷۲۔

۷. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۱۸۔

۸. الضاً، ص ۱۸۔

۹. الضاً، ص ۱۹۔

۱۰. الضاً، ص ۱۹۔

۱۱. الضاً، ص ۱۹۔

۱۲. الضاً، ص ۲۱۔

۱۳. الضاً، ص ۲۲۔

۱۴. الضاً، ص ۲۵۔

۱۵. ڈاکٹر ارشد اقبال، اردو مختصر افسانہ میں سماجی وثقافتی عناصر ،تحقیق (لاہور: بھٹو پرنٹنگ پریس، ۲۰۲۰)، ص ۱۴۵۔

۱۶. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص ۵۱۔

۱۷. الضاً، ص ۵۲۔

۱۸. الضاً، ص ۵۳۔

۱۹. الضاً، ص ۵۵۔

۲۰. الضاً، ص ۵۵۔

۲۱. الضاً، ص ۸۵۔

۲۲. ایضاً، ص۸۶۔

۲۳. ایضاً، ص۹۲۔

۲۴. حمراء خلیق، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، ۱۴ ستمبر ۲۰۲۱ء دوپہر ۳ بجے۔

۲۵. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص۹۳۔

۲۶. خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۰۲)، ص۲۶۰۔

۲۷. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص۱۰۱۔

۲۸. ایضاً، ص۱۰۴۔

۲۹. ایضاً، ص۱۰۵۔

۳۰. ایضاً، ص۲۹۔

۳۱. ایضاً، ص۳۱۔

۳۲. ایضاً، ص۳۳۔

۳۳. ایضاً، ص۳۵۔

۳۴. ایضاً، ص۳۶۔

۳۵. ایضاً، ص۳۷۔

۳۶. حمراء خلیق، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، ۱۴ ستمبر ۲۰۲۱ء دوپہر ۳ بجے۔

۳۷. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص۳۸۔

۳۸. پروفیسر قمر رئیس / سید عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ترتیب (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء)، ص۱۹۰

۳۹. حمراء خلیق، مژگاں تو کھول، ص۴۱۔

۴۰. ایضاً، ص۴۲۔

۴۱. ایضاً، ص۶۵۔

۴۲. ایضاً، ص۶۹۔

۴۳. ڈاکٹر سیما صغیر، ترقی پسند اردو۔ ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ (علی گڑھ: مسلم ایجوکیشنل پریس، ۲۰۱۰ء)، ص۹۲۔

۴۴. حمراء خلیق،مژگاں تو کھول،ص۷۲۔

۴۵. الضاً،ص۷۳۔

۴۶. الضاً،ص۴۴۔

۴۷. الضاً،ص۴۷۔

۴۸. الضاً،ص۴۸۔

۴۹. الضاً،ص۴۸۔

۵۰. الضاً،ص۷۹۔

۵۱. الضاً،ص۷۵۔

۵۲. الضاً،ص۷۹۔

۵۳. الضاً،ص۸۰۔

۵۴. احمراء خلیق،بادلوں کی اوٹ(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۲۰ء)،ص۶۲۔

۵۵. الضاً،ص۶۵۔

۵۶. الضاً،ص۷۰۔

۵۷. الضاً،ص۱۰۴۔

۵۸. الضاً،ص۱۱۶۔

۵۹. حمراء خلیق،چار کتابیں،ص۳۱۶۔

ماحصل

بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو ادب میں جن رجحانات کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سے ایک مارکسزم بھی ہے۔ مارکس کے نظریات کے مجموعے کو مارکسزم یا مارکسیت کہا جاتا ہے۔ جو نظریات کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے ترتیب دیئے۔ مارکس کا دور (۱۸۸۳-۱۸۱۸ء) تک کا تھا۔ سوشلزم کا نام ۱۸ویں صدی کے یورپ میں فرانسیسی انقلاب کے بعد سے رائج ہوا۔ بہت سے مفکرین نے سوشلزم کے بارے میں رائے دی مگر سوشلزم کے بارے میں جامع وضاحت مارکس نے اپنی کتاب کمیونسٹ مینی فسٹیو میں ۱۸۴۷ء میں پیش کی۔

مارکسزم ایک ایسی فکر ہے جو ہمیں انسان اور انسانی سماج کی تاریخ واقعات، حالات جاننے اور انھیں بہتر بنانے کے اصولوں سے متعارف کراتا ہے۔ مارکسزم اصل میں سائنسی علوم کی طرح انسانی سماج کے ارتقا کا علم ہے۔ جو سرمایہ داری نظام کے خاتمے، سوشلزم اور کمیونزم کے قیام کی نوید دیتا ہے۔ مارکسی سائنسی اصولوں کی سماج میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ان اصولوں کو معاشرے سے فراموش نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح جس طرح کائنات میں دن رات کا بدلنا تبدیل نہیں ہو سکتا۔

مارکس کی دریافتوں نے سماجی انقلاب کی راہیں ہموار کیں۔ مارکس کے نظریے سے پہلے یہ بات لوگوں کی نظر سے اوجھل تھی کہ سیاست سائنس اور آرٹ وغیرہ کی خدمت کرنے سے پہلے انسان کو زندہ رہنے کے لیے پانی اور غذا کی ضرورت ہے، ان ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے انسان دوسرے انسانوں سے رشتہ جوڑنے پر مجبور ہے۔ مارکس نے ان نظریات کی مدد سے سرمایہ داری نظام کو جانچا پرکھا اور اس سے نئے نظام کی دریافت کیا۔ مارکس کی معاشی اور سماجی مسائل سے بھرپور لگن نہ صرف جرمنی کے عوام کی تکلیف دہ بدحالی اور محرومی دیکھ کر پیدا ہوئی تھی بلکہ نہایت ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں، برطانیہ اور فرانس کے حالات وواقعات سے بھی ابھری تھی اور اس کے اثرات پوری دنیا نے قبول کیے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اردو ادب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ شاعروں اور ادیبوں نے ان اثرات کو جلدی قبول کر لیا اور اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعے مظلوموں کی طرفداری اور سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت شروع کر دی۔ مارکسی دبستان نے ایسی تخلیقات کو منظر عام پر لانا وقت وحالات کے لیے ضروری سمجھا جو مزدوروں کی سمجھ سے بالاتر نہ ہوں۔ اس لئے اس میں سیدھے سادے، بیانیہ اور

سپاٹ پلاٹ پر زور دیا۔ ادیبوں اور شاعروں کی پوری ایک جماعت اس فکر کی علمبر دار بن کر ابھری اور روسی زبان میں مزدوروں اور مجبوروں کو مخاطب کرنے لگی۔ بعد ازاں اس کے اثرات دیگر یورپی اور ایشیائی زبانوں پر پڑنے لگے۔ اردو ادب میں سب سے پہلے سجاد ظہیر نے اس تحریک کو متعارف کرایا۔ ۱۹۳۲ء میں نگارے کے نام سے افسانوں کا مجموعہ اپنی ادارت میں شائع کرایا۔ ۱۹۳۲ء میں ترقی پسند پہلی کل ہند کانفرنس لکھنو میں منعقد ہوئی جس کی صدارت افسانہ نگار منشی پریم چند نے کی۔

تحریک کے زیر اثر بہت سا شعری و نثری ادب تخلیق ہوا۔ افسانے کی صنف کو عروج ملا اور تنقید کا ایک نیا مکتبہ فکر منظر عام پر آیا۔ ترقی پسند شعرا میں فیضؔ، فراقؔ، علی سردار جعفریؔ، احسان دانشؔ اور ساحر لدھیانویؔ وغیرہ کے نام نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری نے بھی مارکسی واشتراکی فکر کا پرچار کیا۔ افسانہ نگاروں میں اہم نام پریم چند منٹو، عصمت چغتائی، غلام عباس، کرشن چند، احمد ندیم قاسمی راجندر سنگھ بیدی وغیرہ ہیں۔ حمراء خلیق بھی بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو افسانے کا ایک اہم نام ہیں۔ وہ نہ صرف خاکہ نگار، انشائیہ نگار اور مترجم ہیں۔ بلکہ ان کی شخصیت کا ایک اہم حوالہ افسانہ نگاری بھی ہے۔ ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں دو ترجمہ شدہ اور دو طبع زاد ہیں۔ ان کا پہلا طبع زاد افسانوی مجموعہ بعنوان مژگاں تو کھول ۲۰۰۴ء میں اکادمی بازیافت کراچی سے شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مجموعہ بادلوں کی اوٹ سے کے عنوان سے اکادمی بازیافت کراچی سے ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا۔ حمراء خلیق کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا واضح بیانیہ ہیں۔ انہوں نے سادگی سے بالکل عام انسانوں کی کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں میں معاشرتی ناہمواریوں کے علاوہ مارکسزم کی واضح عکاسی بھی کی گئی ہے۔ حمراء خلیق نظریاتی سطح پر بھی معاشرے میں غریبوں کے ساتھ ہونے والے استحصال کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں مارکسی عناصر کارجحان غالب دکھائی دیتا ہے۔ موضوع کے انتخاب کے وقت جو سوالات تحقیق میرے سامنے تھے وہ یہ تھے۔

۱. حمراء خلیق کے افسانوں میں مارکسی فکر کی پیشکش کی نوعیت کیا ہے؟
۲. ان کے افسانوں کے کرداروں میں طبقاتی شعور کا ردِ عمل کس طرح سے سامنے آتا ہے؟
۳. کارل مارکس کے نظریات کی روشنی میں ان کے افسانے مارکسی فکر کی تائید کرتے ہیں یا تردید؟

ان سوالات کی بنیاد پر اس مقالے کو لکھا گیا ہے۔ مقالہ لکھتے ہوئے اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ تمام سوالات کے جوابات ڈھونڈے جاسکیں۔ پہلے باب میں مارکسزم کی تاریخ اس کے مختلف نظریات اور ناقدین کی رائے کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس کے اردو ادب پر اثرات کو مختصراً بیاں کیا گیا کہ کس طرح مارکسی مصنفین اس سے متاثر ہوئے اور اس کا اثر ہمیں ان کی تخلیقات کی صورت میں نظر آیا۔

اس مقالے کے دوسرے باب کے اندر کارل مارکس کہ نظریہ (Alienation) عدم قبولیت کا جائزہ حمراء خلیق کے افسانوں کے ذریعے سے لیا گیا ہے۔ یہ افسانے مارکسی نظریے کی پوری عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ ان نے ان کے دکھ درد کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ معاشرے میں انسانوں کی تقسیم دو طرح کے طبقات کی صورت میں ہوئی ہے ایک بورژوائی اور دوسرا مزدور طبقہ جو زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہے۔ اس طبقے کو بنیادی ضروریات زندگی بھی میسر نہیں ہوتیں۔ برسر اقتدار طبقہ مزدور طبقے کو کسی صورت قبول نہیں کر پاتا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر شخص دوسرے سے بیگانہ ہے۔ انسان کی انسان سے، فرد کی سماج سے، سماج کی فرد سے اور سب سے بڑھ کر انسان کی خود اپنی ذات سے عدم قبولیت کا اظہار ہوتا نظر آتا ہے۔ ایک مزدور پورا دن محنت کے باوجود اگر وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں لا سکتا تو پھر اس کی معاشرے کے اندر کوئی قبولیت نہیں۔ اس کو اس معاشرے میں اپنی مرضی سے جینے کا حق، اپنی مرضی سے خوشیوں کو منانے کا حق اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک مزدور ہے۔ معاشرے نے ذات پات کی تقسیم کر کے انسانوں سے اُن کے جینے کا حق چھین رکھا ہے۔ یہ سب غیر متوازن طبقاتی تقسیم سے جنم لینے والے مسائل ہیں۔ اس مقالے کے اندر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ معاشرے میں موجود قدروں کو وضع کرنے والے، انسانوں کے لیے اتنے وسائل ہی پیدا نہیں کرتے جن سے وہ اپنے بیوی بچوں کو پال سکیں۔ ان کی وجہ سے معاشرے میں غربت، افلاس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

حمراء خلیق کے افسانوں میں معاشرے کی اس طرح کی اقدار وضع ہو چکی ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ بچوں کا رویہ دن بدن برا ہوتا جاتا ہے۔ بچہ جب سے پیدا ہوتا ہے اس کی پرورش کی خاطر ماں باپ محنت، مشقت برداشت کرتے ہیں۔ سردی ہو یا گرمی، صحت مند ہوں یا بیمار وہ اپنی اولاد کی خاطر، اس کے اچھے مستقبل کی خاطر، ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتے ہیں لیکن جب بچوں کی باری آتی ہے تو وہ انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

حمراء خلیق کے افسانوں کا بنیادی موضوع غربت ہے۔ غربت کی وجہ سے نچلے طبقے کو کھانے کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب تب سمجھ آتا ہے، جب ان امید بھری آنکھوں کی طرف دیکھا جائے جو سوال کرتی ہیں۔ نچلے طبقے کے حالات کبھی بدل نہیں سکتے، وہ خواب تو دیکھتے ہیں مگر ان کو خوابوں کی تعبیر نہیں ملتی، اس لیے ان کی سوچوں کی حدود ہی محدود ہوتی ہے۔ وہی دو وقت کی روٹی، نچلے طبقے کا بڑا المیہ تلاش معاش تو ہوتا ہی ہے، اس کے علاوہ اُن بیماریوں، پریشانیوں، مصیبتوں نے انھیں الگ گھیرا ہوتا ہے۔ گھر کا ایک فرد اگر کما رہا ہے، تو اس کے ساتھ اگر کوئی مسئلہ پیش آجائے تو پورا گھر مصیبتوں کی نظر ہو جاتا ہے۔

حمراء خلیق نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے اندر عورت کی بھی مختلف سطحوں پر عدم قبولیت کو واضح کیا ہے۔ عورت کے حوالے سے دیکھا جائے تو مرد معاشرے کے نام نہاد قوانین سے چھپ کر عورت کے ساتھ تعلقات تو بنا لیتا ہے مگر جب اس کو معاشرے میں عزت و مقام دینے کی بات آتی ہے تب وہ معاشرے میں اپنی جھوٹی عزت کی خاطر خاموش ہو جاتا ہے۔ عورت مرد کے لیے چاہے جتنا بھی خوشی کا سامان پیدا کر لے وہ کبھی بھی اس کو وہ مقام و مرتبہ نہیں دیتا جس کی وہ حق دار ہے کیوں کہ وہ اسے کسی اور روپ میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔
معاشرے میں لوگوں کی بے حسی کی وجہ سے کوئی کسی کے درد و غم میں شریک نہیں ہوتا، لوگوں کو کسی کے معاملات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی بھوک سے سردی سے مرے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جس اونچے طبقے کے درمیان وہ رہ رہے ہوتے ہیں، ان کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی حالانکہ وہ ان کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ اپنے فرائض کی انجان دہی کر رہے ہوتے ہیں، انھیں غریب اور بے بس طبقے کی زندگیوں کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ ان کے لیے اپنے معاشی معیارات اور مادی زندگی زیادہ اہم ہے۔ غریب کے مسائل اور ان کی ضروریات کو سمجھنا انھیں وقت کا ضیاع لگتا ہے۔ اس لیے نچلا طبقہ ہمیشہ ان کی ترجیحات سے خارج رہتا ہے۔

اس مقالے کے تیسرے باب میں مارکس کے نظریہ بالائی کے تناظر میں حمرا خلیق کے افسانوں کا مطالعہ کیا گیا۔ بالائی ساخت معاشرے پر بہت سے اثرات مرتب کرتی ہے کیوں کہ اس کے اختیار میں پورا سماجی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جس کو اپنے حساب سے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کی زندگیوں تک کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنے کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مفادات کی خاطر کوئی بھی روپ اپنانے کے عادی ہیں کیوں کہ ان کی زندگی میں نہ کا لفظ نہیں ہوتا۔ دولت کے ذریعے لوگوں کو، چیزوں کو چھیننے کے عادی ہوتے ہیں۔ بالائی ساخت کے اندر انسانیت نام کی چیز

نہیں ہوتی، وہ لوگوں کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ زیریں ساخت کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آتی کیوں کہ بنیاری ضروریات زندگی پر ہی وہ قابض ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی خواہشات ہی پوری نہیں کر پاتے۔ ان کے بچے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے ہیں مگر وہ کچھ نہیں کر پاتے۔ جبکہ بالائی ساخت کا رویہ جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ ان کے بچوں تک کو احساس کمتری میں مبتلا کیا جاتا ہے، ملازم بچوں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے جائز حقوق تک سلب کر لیے جاتے ہیں۔ ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

مقالے میں حمراء خلیق کے افسانوں کا موضوع طاقتور کے ہاتھوں کمزور طبقے کا استحصال ہے۔ بالائی ساخت معاشرے میں طاقتور ہونے کی وجہ سے خود کو مختار کل سمجھتی ہے۔ وہ نچلے طبقے کی اچھائیوں کا صلہ بھی برائیوں سے دیتے ہیں، ان کا رویہ ہمیشہ سے ظالم حکمران کی طرح ہوتا ہے۔ وہ انھیں اپنی رعایا سمجھ کر برا سلوک کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ان کی خوشیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہ نچلے طبقے کے مقابلے میں ہمیشہ اپنے جیسوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ خود کو طاقتور سمجھنے کی وجہ سے زیریں ساخت کی خودداری کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ صاحب اقتدار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس یہ حق ہے کہ وہ دوسروں کا استحصال کر سکے۔ وہ غریب طبقے کی زندگی کا ہر فیصلہ کرے گا چاہیے وہ ان کی ضروریات کے حوالے سے ہو یا ان کی زندگی کا کوئی اور پہلوں مد نظر ہو۔ وہ زندگی کے ہر معاملے کا اختیار اپنے پاس رکھتے ہیں اور پھر ان کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ ان کی عزت تک کا سودا کرنے سے گریز نہیں کرتے، وہ صرف اس کی ماہانہ اجرت کے مالک نہیں ہوتے بلکہ ان کی عزتوں کے بھی مالک ہیں جو ان کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔

صاحب اقتدار طبقے کا انداز زندگی بہت شاہانہ ہے وہ ایک دوسرے کے آگے حساس برتری پیدا کرنے کے لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے مہنگی سے مہنگی گاڑی، مہنگے سے مہنگا گھر خریدتے ہیں۔ کبھی کبھی کچھ تو اپنی حیثیت سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ معاشرے میں اصل اہمیت پیسے کی ہے اور ہر کوئی پیسے کا ہی پجاری ہے۔ مادیت کے نشے میں اپنے سے کم تر کو تو انسان سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ ہمارا معاشرہ دو طبقات کی جنگ میں ایسا بٹا ہوا ہے جس میں ہر ایک کے ساتھ مساوی سلوک نہ رکھنے کی وجہ سے طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہے، نچلا طبقہ خود کو کم تر سمجھتا ہے جبکہ اس بات کا احساس ہر گھڑی ہر پل دلاتا ہے کہ وہ ان کے ماتحت ہیں، تاکہ وہ خود کو ہمارے مد مقابل نہ سمجھ لیں۔ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے جس سے انھیں اپنی حدود کا

انداز رہے اور وہ انھیں تجاوز نہ کر سکیں۔ ان کے بچوں تک کو احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ ان سے ہر لحاظ سے کم حیثیت رکھتے ہیں۔ جس وجہ سے وہ ساری عمر نیچے دب کر رہ جاتے ہیں۔

باب چہارم کے اندر دوسرے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ حمراء خلیق کے افسانوں کے کردار اپنی زندگی میں مسلسل جدوجہد اور کشمکش کی کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے کردار غربت کی چکی میں پستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ والدین کے لیے بچوں کی دووقت کی روٹی پوری کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مارکسی نظریہ کے مطابق معاشرے کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ نچلے طبقے کی مشکلات کبھی کم نہیں ہوتیں۔ وہ پوری زندگی محنت مزدوری کرتے رہتے ہیں، اور ان کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی وہ جس حیثیت سے پیدا ہوئے ہوتے ہیں اُسی میں مر جاتے ہیں۔ کبھی حمراء خلیق کے کردار اپنی بھوک کو مٹانے کے لیے اپنی عزت تک کا سودا کر دیتے ہیں۔ معاشرے کے ایسے رویے کی وجہ سے اپنا جسم تک بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

حمراء خلیق کے افسانوں کے کرداروں کے اندر بہت حساس رویہ پایا جاتا ہے۔ ان کی شرافت، ان کی اچھائی کا لوگ ناجائز فائدہ اٹھتے ہیں۔ وہ ہر ایک کے غم کو اپنا غم سمجھ کر شریک ہو جاتے ہیں، لیکن جب ان کی باری آتی ہے تو وہ خود کو ہمیشہ اکیلا ہی پاتے ہیں۔ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔

حمراء خلیق نے ایسے موضوعات کو اپنے افسانوں کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جو مارکسی فکر کی عکاسی کرتے ہیں، معاشرے کا اونچا طبقہ نچلے طبقے کے ساتھ ہمیشہ سے برا سلوک کرتا ہے، انھیں انسان تک تصور کرنے کا روا نہیں ہوتا۔ ان کے بچوں تک سے ان کا رویہ اچھا نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ بھی یہ لوگ انسانوں کی طرح پیش نہیں آتے۔ نچلے طبقے کے بچے حسرتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں پھر انہی حسرتوں، امیدوں کو لیے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر معاشرے کا کوئی شخص اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے اوپر اگر مشکل وقت آجائے تو یہ معاشرہ اسے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان کی بے بسی جیسے انھیں سکون دلائی ہے۔

حمراء خلیق کے افسانوں کے کردار مارکسی حوالے سے ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس مقالے کے ذریعے کی گئی ہے۔ نچلے طبقے میں سے کوئی جب اپنے بچوں کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے نکلتا ہے تو اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے، جس سے وہ تنگ آکر اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ انھیں ہر

بات میں طعنے دیے جاتے ہیں، ان کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے وہ قبول نہیں کر پا رہے ہوتے کہ کوئی ان کی برابری بھی کر سکتا ہے یا ان کے مد مقابل بھی آسکتے ہیں۔ ان کے بچوں کو دماغی طور پر مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ پوری زندگی احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔

ان کے کرداروں کے زریعے معاشرے کے اندر ہونے والی تمام ذیابیتوں کی واضح تصویر نظر آتی ہے جس کی وضاحت ان ابواب کے اندر جامع طریقے سے کی گئی ہے۔ تاکہ معاشرے کے اندر ہونے والے مظالم کو بے نقاب کیا جائے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے افسانوں میں مارکسی فکر کی عکاسی بہت جامعت سے کی گئی ہے۔ معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والا انتشار اور بے ضابط گیاں ان کے افسانوں کا بنیاد موضوع ہیں۔ اس انتشار سے غریب طبقے کی ساری زندگی بے بسی اور مجبوری کی نظر ہو جاتی ہے۔ وہ ساری زندگی اس کشمکش میں گزار دیتے ہیں کہ کب ان کے حالات بہتر ہوں گے اور وہ اپنی بنیادی ضروریات کو حاصل کر سکیں گے۔ اسی تک و دو میں ان کی نسلیں جوان ہو جاتی ہیں اور پھر وہ اس غربت اور مفلسی کی چکی میں پسنا شروع ہو جاتے ہیں

حمراء خلیق نے بالائی طبقے کی سوچ اور ذہنی سطح کو بے نقاب کر کے در حقیقت معاشرے کے ان ناسوروں سے پردہ اٹھایا ہے جو اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اس طبقے کے لیے اپنی ضروریات کی فراہمی اہم نہیں ہے بلکہ ان کے لیے وہ اس طبقے کو احساس کمتری اور احساس محرومی سے دوچار رکھتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی کے بلند مقاصد کے بارے میں کبھی سوچ ہی نہ سکیں۔ اسی وجہ سے حمراء خلیق کے افسانوں کے کردار مجبوری اور بے بسی کے ساتھ ساتھ احساس کمتری کے کرب سے بھی دوچار نظر آتے ہیں۔ یوں ان کے افسانوں کی مجموعی فضا مارکسی فکر اور اس فکر سے متاثرہ کرداروں کی بہترین عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔

ماخذات

احمد وانی، ہلال۔ مارکسزم اور اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔غیر مطبوعہ مقالہ پی-ایچ-ڈی، سرینگر: شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی حضرت بل، ۲۰۱۵ء۔

اشرفی، وہاب۔مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۱۹ء۔

اشفاق، حمیرا۔(ترتیب وتدوین)فکری و نظری مباحث۔لاہور: سانجہ پبلشرز، ۲۰۱۲ء۔

اشفاق، مرزا بیگ۔ مارکسی فکر و فلسفہ کے خدوخال۔لاہور: چوہدری غلام رسول اینڈ سنز پبلشرز ،س،ن۔

اعظمی، الرحمٰن۔اردومیں ترقی پسند ادبی تحریک ۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ ،۲۰۰۲ء۔

اعظمی، منظر۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۶ء۔

افراہیم، صغیر۔اردو افسانہ تعریف، تاریخ اور تنقید۔ نئی دہلی: براؤن بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔

اقبال، ارشد۔اردو مختصر افسانہ میں سماجی وثقافتی عناصر ،تحقیق۔لاہور: بھٹو پرنٹنگ پریس، ۲۰۲۰۔

اقبال، طاہرہ۔پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵ء۔

"ترقی پسند تحریک کی مجلاتی صحافت: ایک جائزہ ۱۹۳۶ء تا ۲۰۱۱ء"، مشمولہ تحقیق نامہ، شمارہ ۱۸، جنوری تا جون ۲۰۱۶ء۔

انجم، شفیق۔اردو افسانہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں۔اسلام آباد: یورپ اکادمی، جولائی ۲۰۱۰ء۔

اویسی، ارشد، ڈاکٹر ممتاز خان کلیانی۔ "مارکسی نظریہ اردو کے بنیاد گزار مارکسی ادیب"، مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو) شمارہ، ۳۱ دسمبر ۲۰۱۸ء۔

آغا، سلیم قزلباش۔ جدید اردو افسانے کے رجحانات۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء۔

بشیر، محمد۔ (ترجمہ نگار)، فلسفہ مغرب کی تاریخ۔ اسلام آباد: یورپ اکادمی مئی ۲۰۱۰ء۔

بلوچ، رخسانہ راشد۔ "بدلتا سماج اور عصری تناظر" مشمولہ الماس (تحقیقی جرنل)، شمارہ ۲۲، ۲ جنوری ۲۰۲۰ء۔

بی، زاہدہ۔ راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ۔ علی گڑھ: وانگ مایا بکس، ۲۰۱۴ء۔

بی بی، تحسین۔ پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی شعور ۱۹۴۷ء تا ۲۰۱۱ء۔ غیر مطبوعہ مقالہ پی-ایچ-ڈی، اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز۔

بیگ، مرزا حامد۔ اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳ء ۱۹۹۰ء۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان دسمبر، ۱۹۹۱ء۔

جارج، ہنری، ۔ (مترجم) آئی یو جرال، ترقی اور افلاس۔ اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۲۱ء۔

حسن، سبط۔ موسیٰ سے مارکس تک۔ کراچی: ملک نورانی مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبر ۲ عبداللہ ہارون ۱۹۷۷ء۔

حسن، محمد۔ مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ۔ نئی دہلی: اردو بیورو ۲۰۰۰ء۔

حسین، اختر رائے پوری۔ "ادب اور زندگی" مشمولہ: ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ترتیب و تدوین ڈاکٹر قمر رئیس / سید عاشور کاظمی، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء۔

حسیب، عنبر۔ اردو میں ترقی پسند تنقید کا تحقیقی مطالعہ۔ کراچی: احمد گرافکس، ۲۰۱۶ء۔

حسین، شکیل / احماد، رسول / شازیہ، عنبرین۔ مشمولہ تحقیق نامہ شمارہ ۲۸، جنوری تا جون ۲۰۲۱۔

خلیق، حمراء۔ کہاں کہاں سے گزر گئے ۔ لاہور: سانجھ پبلشر ۲۰۱۵ء۔

خلیق، حمراء۔ چار کتابیں۔ کراچی: اشارات پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۷ء۔

خلیق، حمراء۔ مژگاں تو کھول۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء۔

خلیق، حمراء۔ بادلوں کی اوٹ۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۲۰ء۔

راہی، اعجاز۔ اردو افسانہ میں اسلوب کا آہنگ۔ راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۳ء۔

رسول، حماد، / ڈاکٹر قاضی عبدالرحمٰن عابد۔ "سبط حسن: مارکس اور مشرق "مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو) شمارہ ۱، ۳۱ دسمبر ۲۰۱۵ء۔

رئیس، قمر / سید عاشور کاظمی۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ترتیب۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء۔

روبینہ۔ "سبط حسن: مارکس اور مشرق "مشمولہ الماس (تحقیقی جرنل)، شمارہ ۱۸، ۲۰۱۶ء۔

روبینہ۔ "پریم چند کے ناولوں میں طبقاتی شعور" مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو)، شمارہ ۲۷، جون ۲۰۱۵ء۔

ریحان، نگہت خان۔ اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ۔ لاہور: شاد سنز پرنٹرز، ۱۹۸۸ء۔

شاہد، حمید۔ اردو افسانہ صورت و معنی۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۰۶ء۔

شوکت، علی۔ "اردو ادب پر مارکسی اثرات "مشمولہ ادراک شمارہ ۱، ۳۰ جون ۲۰۱۸ء۔

صادق۔ ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ ۱۹۳۶ سے ۱۹۵۶ تک۔ دہلی: اردو مجلس ۱۹۸۱ء۔

صغیر، سیما۔ ترقی پسند اردو-ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ۔ علی گڑھ: مسلم ایجوکیشنل پریس، ۲۰۱۰ء۔

ناتھ، جگن آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین۔ لاہور: مکتبہ جدید پریس، دسمبر ۲۰۱۶ء۔

ندیم، روش۔ "منٹو کے ہاں طبقات کی نمائندگی کا پس منظر" مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو) شمارہ ۲۶، دسمبر ۲۰۱۴ء۔

نیر، ناصر عباس۔ جدید اور مابعد جدید تنقید۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، دسمبر ۲۰۰۴ء۔

ہاشم، ادیبا۔ حمرا خلیق کی ادبی خدمات۔ غیر مطبوعہ مقالہ ایم۔فل، ملتان: دی ویمن یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء۔

۵۸. https://n/pd.gov.pk/uakhbareurdu/DecJanuary2014/jan-12.htmlبخت میر صاحب آبادی "ہمارا معاشرہ اور منٹو" بتاریخ ۲۰۲۲-۰۲-۲۵، بوقت ۱۲:۲۵۔

۵۹. https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%D9%85%D8%A7%D8%B1%DA%A9%D8%B3%DB%8C%D8%AA

سوال نامہ

۱۔ آپ کے افسانوں کے اکثر مرکزی کردار نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، کیا اس کی وجہ ترقی پسندانہ فکر سے نظریاتی دلچسپی یا وابستگی ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟

۲۔ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم کا جو تصور ہے اُس سے کس حد تک آپ اتفاق کرتی ہیں؟

۳۔ قیام پاکستان سے قبل جو معاشی تقسیم کا تصور تھا اور جو آج ہمارے ملک میں اعلیٰ طبقات ہیں دونوں میں آپ کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

۴۔ ہمارے معاشرے میں محنت کش طبقہ کس حد تک اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے خود آگاہ ہے؟ اور کیا یہ آگہی آپ کے افسانوں کے کرداروں میں بھی نظر آتی ہے۔

۵۔ آپ کے افسانوں میں کس کردار میں حمرا خلیق کی شخصیت نظر آتی ہے اور کون سا کردار آپ کے دل کے قریب ہے۔

۶۔ آپ نے اپنے کالج کے زمانے میں کون سی پہلی کہانی لکھی تھی۔

۷۔ ہمایوں، محنت، افسانے میں مجھے آپ کی شخصیت نظر آئی ہے میری اس بات سے آپ کس حد تک متفق ہیں؟

Scanned with CamScanner

۸۔ آپ کے دو افسانوی مجموعوں میں اتنے لمبے وقفے کی کیا وجہ ہے؟

۹۔ دونوں افسانوی مجموعوں کے موضوعات میں فرق کی کیا وجہ ہے؟

۱۰۔ "بادلوں کی اوٹ میں" افسانے میں رومانس نظر آتا ہے اور "حشرگاں تو کھول" میں معاشرے کی محرومیوں کو دکھایا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

International Islamic Univ.
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD.

حمرا خلیق

۱۳ ستمبر ۲۰۲۱ء

Scanned with CamScanner